اسلام اپنی نگاہ میں

تصنیف: ولیم چیٹک

ترجمہ

سہیل عمر

(حصہ اول)

انٹرنیٹ ایڈیشن دوم سال 2006

www.iqbalcyberlibrary.net

فہرست

تمہید

نیویارک سٹیٹ کی سرکاری یونیورسٹی (سٹونی بروک) کے شعبہ مطالعات دین میں ۱۹۸۳ء سے لے کر اب تک سال میں ایک مرتبہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اسلام پر ایک تعارفی کورس پڑھاتا رہا ہے۔ یہ کتاب اسی کورس کی دین ہے۔ تدریس کے دوران میں ہماری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ وہ نقطہ نظر، وہ تصور اور وہ تناظر پڑھنے اور پڑھانے والوں کی گرفت میں آ جائے جو اسلام کے بنیادی مآخذ میں روح رواں کی طرح جاری و ساری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس تصور کو آج کی زبان میں بیان بھی کر دیا جائے۔ آغاز ہی میں ہمیں ایک مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ بھانت بھانت کے طالب علموں کو اسلام کس طرح پڑھایا جائے؟ ان کی اکثریت نیویارک، اس کے گردونواح یا لونگ آئی لینڈ کے علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں امریکی اور دوسری قوموں کے لوگ سبھی شامل تھے۔ عام طور پر ان میں سے ایک تہائی طالب علم وہ ہوتے تھے جن کے والدین یا ان سے پچھلی پیڑھی میں لوگ اسلامی دنیا کے مختلف گوشوں سے آ کر امریکہ میں آباد ہوئے، چین اور انڈونیشیا کے ساحل سے آنے والوں سے لے کر البانیا اور مراکش کے باسیوں تک۔

اسلام پر اس کورس کو پڑھنے سے غیر مسلم طلبا کی اکثریت کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کی طرف سے جتنے تعلیمی تقاضے ہیں انہیں پورا کیا جا سکے یا محض یہ کہ اس کورس کے اوقات تدریس میں انہیں اپنے لیے ایک سہولت نظر آ رہی ہوتی ہے۔ مسلمان طلبا اس کورس میں کئی اسباب سے شریک ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض طلبا میں اسلام سے ایک لاتعلقی کے باوجود امریکی معاشرے سے اتنی بے اطمینانی جنم

لے چکی ہوتی ہے کہ وہ انہیں اپنی اصل کی تلاش میں کوشاں ہونے پر مجبور کر دے۔ کچھ طلبا کے والدین یا بڑوں کا اصرار ہوتا ہے کہ وہ اس کورس میں شریک ہو کر اپنے دین کے بارے میں کچھ سیکھیں۔ کچھ طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس زعم میں شریک درس ہو جاتے ہیں کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں لہٰذا ان کو آسانی سے اس کورس میں ''اے'' گریڈ مل جائے گا۔ (ان بے چاروں کا خواب جلد ہی چکنا چور ہو جاتا ہے)۔گاہے گاہے اُن نظریاتی گروہوں سے منسلک کوئی طالب علم بھی آ جاتا ہے جنہیں ہم ''بنیاد پرستی'' کے عمومی عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ایسے طالب علم ہماری کلاسوں میں اس لیے آتے ہیں کہ بذات خود یہ دیکھ سکیں کہ غیر مسلم اہل علم پر اسلام کے بارے میں رائے دینے کے سلسلے میں اعتماد کیوں نہیں کیا جاتا۔

جب ایسے طرح طرح کے لوگوں سے بات کرنا ہو تو مسئلہ زیادہ شدید ہو جاتا ہے کہ ان رنگا رنگ مخاطبین کے سامنے اسلام کو کیسے پیش کیا جائے کہ انہیں سمجھ بھی آ جائے اور اس میں تحریف بھی نہ کرنا پڑے۔مسلمان طلبا اپنے دین کے بارے میں عموماً کچھ نہیں جانتے لیکن دبے دبے رہتے ہیں، دفاعی انداز میں۔ جانتے تو مغربی طلبا بھی کچھ نہیں لیکن ان کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ان دو طرح کے طالب علموں کو اسلام کیسے سمجھایا جائے؟ ایک طریقہ جو ہم نے ہمیشہ استعمال کیا ہے یہ ہوا کرتا ہے کہ طالب علموں سے وہ کتابیں پڑھنے کو کہا جائے جو معاصر اہل قلم نے اسلام پر تصنیف کی ہیں اور جو اسلام کے بارے میں دیانت اور ہمدردی سے بات کرتے ہیں۔خوش قسمتی سے ایسی کتابوں کی تعداد بڑھ رہی ہے[1]۔ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اسلام کو یوں نہ پڑھایا جائے کہ وہ ایک اجنبی، تیسری دنیا کی پیداوار یا آثارِ قدیمہ کی قبیل کی کوئی شے معلوم ہونے لگے بلکہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا جائے جس سے

پتا چلے کہ اسلام وہ تصورِ کائنات ہے جو آج بھی کروڑوں لوگوں کی زندگی کو معنی عطا کررہا ہے۔ ہمارے لیکچروں اور گفتگو کا ہدف آغاز ہی سے یہ رہتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ اسلام خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہے، خود کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے ہماری تدریسی کاوشوں اور ہماری گفتگو کا ماحصل ہے۔

ایسی کتابیں تو بہت سی ہیں جو اسلام کو آج کی دنیا کے لیے ایک بامعنی اور زندہ حقیقت قرار دیتی ہیں لیکن ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جو یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ مسلمان کی نگاہ میں یہ کائنات کیا ہے۔ ان کتب میں اگر مسلمانوں کی آراء سے استفادہ کیا بھی جاتا ہے تو ان لوگوں کی باتوں کو حوالہ بنایا جاتا ہے جنہوں نے سیاسی اندازِ فکر اختیار کیا اور جدید میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاں حقیقت و ماہیتِ اشیاء پر سنجیدہ اور نرم روگفت وشنید کا فقدان ہے۔ اس کی جگہ ان کے ہاں ڈرامائی اعلانات اور کیمرے کے لیے پرکشش واقعات نے لے رکھی ہے۔ اسلامی دنیا کے مراکزِ علم میں روایتی زاویۂ نظر یہ نہیں ہے۔

مغرب میں لکھی جانے والی کتب میں سے بعض میں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ فکرِ اسلامی کو اس کی گہرائی میں واضح کیا جائے لیکن ان کتب میں مبتدی طلباء کے لیے مشکلات بہت ہوتی ہیں۔ اوّل تو ان کو پڑھنے کے لیے دین کے بارے میں تفصیلی علم درکار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ان میں زبان ایسی استعمال کی جاتی ہے جو بنیادی طور پر مغربی روایت علم سے مستعار ہوتی ہے۔ ان کتب میں اگر کہیں قرانی اسلوبِ بیان اور اصطلاحات پر انحصار کیا بھی جاتا ہے تو بھی ان میں یہ شاذ ہی نظر آتا ہے کہ

مصنف نے اسلام کی اپنی عقلی روایت کی پوری گہرائی، گیرائی اور تنوع پر توجہ دینے کی زحمت کی ہو۔

اس کتاب میں ہمارا ہدف یہ رہا ہے کہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ اسلام خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہے؟ ''اسلام'' سے ہماری مراد ہے وہ عظیم کتابیں جو (حالیہ دور سے پہلے تک) متفقہ طور پر اسلامی روایت کی معیاری تصانیف اور نشانات ِعظمت مانی گئی ہیں۔ ہر عظیم مذہب کی طرح اسلام کے بھی نمایاں اور شاندار سنگ میل ہیں اور ہم نے انہی کی مدد سے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کا تارو پود قرآن مجید سے اٹھا ہے۔ ایک بہت گہرے معنی میں اسلام قرآن ہے اور قرآن اسلام ہے۔ قرآن کی بنیادی شرح وو ضاحت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ ان کے بعد بڑے بڑے لوگ فقہا، متکلمین، فلسفی، اولیا، حکماء ہر زمانے کی ضرورت کی مطابق اسلام کے اصل تصور کے بارے میں توضیحات اور شرح وتبیین کرتے آئے ہیں۔

اسلام کی اپنی ایک کائنات ہے۔ ہم نے اس کتاب میں اس کائنات کی جانب ایک درباز کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمیں اس چیز سے سرے سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اسلام کو جدید علمی دنیا کے ان رائج الوقت نقطہ ہائے نگاہ میں سے کسی ایک غالب نقطۂ نظر کی کسوٹی پر پرکھا جائے جن میں اپنے آپ کو جاننے کے لیے، خودشناسی کے لیے مختلف معاصر معیارات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہم اسلام کو ماضی کے ان عظیم مسلمانوں کی نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں جن کے ہاتھوں تفسیر وتعبیرِ قرآن کے مرکزی اور بڑے اسالیب کی صورت گری ہوئی اور جن کے ذریعے اسلام میں فہم دین کی روایت کی تشکیل ہوئی۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم صرف اسلام کی کلاسیکی کتب میں سے اقتباسات لے کران کا ترجمہ ایک مجموعے کی شکل میں پیش کر دیں گے۔ کلاسیکی متون ان لوگوں کے لیے نہیں ہوتے جو ابھی اسلام کے مطالعہ کا آغاز کر رہے ہوں۔ ان کتابوں کے تقاضے ان کی ہمت سے سوا ہوتے ہیں کیونکہ یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے لکھی ہی نہیں گئیں جو کسی دوسرے ثقافتی دائرے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کتابوں کے مخاطب وہ لوگ رہے ہیں جن کا طرزِ فکر کم وبیش وہی تھا جو ان کتابوں کے مصنفین کا تھا اور جو دنیا کی دید کا وہی زاویہ اپنائے ہوئے تھے جو ان کتابوں کے لکھنے والوں کے پیشِ نظر تھا۔ مزید براں یہ کتابیں بالعموم ان لوگوں سے کلام کرتی تھیں جنہیں اسلامی علوم پر ایک منتہیانہ دسترس حاصل تھی۔ اسلامی علوم پر ایسی نظر اور ان پر یہ عبور ہماری یونیورسٹیوں کے گریجویٹ سکولوں میں بھی فراہم ہونا ناممکن ہے، انڈر گریجویٹ سطح کا تو ذکر ہی کیا!

اسلامی روایت کی کلاسیکی کتب کا کردار آج کی درسی کتب سے مختلف رہا ہے۔ درسی کتابوں میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر چیز کو ایک نسبتاً ابتدائی صورت میں واضح کر دیا جائے۔ اس کے برعکس کلاسیکی کتب اس غرض سے لکھی جاتی تھیں کہ کسی ایک موقف یا مبحث کو اس کے وسیع فکری تناظر میں رکھ کر دیکھا جا سکے۔ ان کتب میں اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مصنف نے اپنے دلائل کا صرف اجمالی خاکہ درج کر دیا اور اس کی تفصیلات کتاب کو پڑھانے والے حضرات نے دورانِ درس زبانی بیان کر دیں۔ طالب علم بھی کتاب کو لائبریری سے آج جاری کروا کے اگلے ہفتے واپس کرنے کے معمول سے آزاد تھے۔ ان کی اکثریت کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کر کے اپنا نسخہ تیار کرتی تھی اور پھر کسی ماہر استاد کے پاس بیٹھ کر مہینوں بلکہ سالوں تک

کتاب کو لفظاً لفظاً پڑھتی تھی۔ ہمیں اس عمل کا ذاتی تجربہ ہے اور ہم اسلامی دنیا کے ایسے حلقہ ہائے درس میں شامل رہے ہیں جہاں کلاسیکی متون کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر استاد اچھا ہو تو وہ آسانی سے کسی ایک لفظ یا کسی فقرے کو لے کر اس سے ایک جہانِ معنی برامد کرتا چلا جاتا ہے۔

ہم نے ان کلاسیکی کتابوں کو اپنے قارئین کے سامنے رکھنے کے بجائے یہ کیا ہے کہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیا نقطۂ نظر، کیا تناظر ہے جو ان کتب کے پسِ پشت کارفرما ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری کوشش یہ بھی رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کتابوں اور جدید دنیا کی بھاری بھرکم عالمانہ کتابوں میں استعمال ہونے والے مجرد اور اصطلاحی اسلوب بیان اور الفاظ سے گریز کیا جائے۔ ہم نے یہ سعی بھی کی ہے کہ قرآن کے اپنے طرزِ بیان کو سامنے رکھا جائے اور اس کی شرح و وضاحت کے لیے اس کا خلاصہ کرنے کے بجائے اقتباسات دیئے جائیں۔

ہمیں بخوبی علم ہے کہ آج کے بہت سے مسلمانوں میں ان کتب سے ایک بیزاری پائی جاتی ہے، ان کی نظر میں یہ سب فرسودہ اور از کار رفتہ مواد ہے۔ وہ اپنے اس فکری ورثے کو، اس میراثِ فکر کو چھوڑ کر اس کی جگہ کسی زیادہ ''سائنٹیفک''، علمی کاوش مثلاً سوشیالوجی کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام کی میراثِ فکر، اس کی عقلیات کا وسیع ذخیرہ غیر ضروری اور لایعنی ہے اور صرف قرآن ہمارے لیے کافی ہے وہ روحِ عصر یا اپنے زمانے کے رجحانات کے سامنے سپر ڈال چکا۔ جو لوگ ماضی کی شرح و تعبیر کو یوں نظر انداز کرتے ہیں ان کے نصیب میں صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اپنی کتاب کو آج کے مروّجہ تناظر اور لمحۂ حاضر کے مقبول تصورِ کائنات کی روشنی میں دیکھیں اور اسی کے حوالے سے اس کی تفسیر کریں۔ پھر بات

کچھ اور ہو جاتی ہے، راستہ بدل جاتا ہے ۔ ہمارے بڑے علماء جو کچھ ہمیشہ لکھتے آئے ہیں یہ اس سے مختلف چیز بن جاتی ہے ۔وہ لوگ اپنے موجود کی، اپنے لمحۂ جاری کی شرح وتعبیر اپنی عظیم الشان روایت کی روشنی میں کرتے تھے اور کبھی خود کو تقاضائے وقت کے سحرِ گریزاں کا شکار نہیں ہونے دیتے تھے کہ ''آج کے مطابق'' ہونے سے زیادہ لحاتی، گریزپا اور پرفریب تجریدی چیز اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

اسلام پر جو تعارفی کتب ہماری نظر سے گذری ہیں ان میں یہ دیکھنے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا فہمِ حقیقت کیا ہے، مسلمان حقیقت کسے کہتے ہیں؟ قارئین کو یہ تو بتا دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی اہمیت بنیادی ہے یا یہ کہ مسلمانوں کے خدا کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں عقائد یہ ہیں لیکن ایسا شاذونادر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والے سرسری انداز میں ذکر کرنے سے بڑھ کر صحیح معنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اصل میں ان عقائد کا مطلب کیا ہے ۔ان کتابوں میں عام طور پر ہوتا کیا ہے، فکرِ اسلامی کی ایک مختصر سی تاریخ جسے پڑھ کر مسلمان مفکرین ایک طرح سے کم عقل محسوس ہونے لگتے ہیں اور قاری یہ کہہ اٹھتا ہے کہ آخر ان غیر متعلق سوالات پر بحث کرنے میں ان لوگوں نے اتنا وقت کیوں برباد کیا؟ اسلام پر لکھنے والے جو اہلِ قلم ذرا ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں وہ یہ وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مباحث اپنے زمانے میں، اپنے تاریخی تناظر میں اہمیت رکھتے تھے ۔یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ مباحث آج بھی اتنے ہی بامعنی اور اہم ہیں جتنے اپنے زمانے میں تھے اور ان پر آج بھی مغرب کے تمدنی دائرے میں زوروشور سے مباحثہ جاری ہے، ہاں اس کی اصطلاحات اور لفظیات میں تبدیلی آ گئی ہے۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ اسلامی روایت میں ہمیں بڑے بڑے سوالات کے بڑے اور اہم

جوابات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، ایسے سوالات جن کے بارے میں ہر انسان کبھی نہ کبھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے زمانے کا رجحان یہ ہے کہ ان سوالات کو غیر متعلق یا لاینحل یا خود شکن قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ ہمارا اشارہ ان سوالات کی طرف ہے جو ایک پانچ سالہ بچہ فطری طور پر پوچھنا چاہتا ہے، کیوں، کیسے، کیا؟ اور پھر اپنے بڑوں کے خوف استہزاء سے گھبرا کر چپکا رہ جاتا ہے۔ ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ پیدا ہونے سے پہلے ہم کہاں تھے؟ مرنے کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟ یہ دنیا کہاں سے آئی؟ خدا کیسے پیدا ہوا؟ فرشتے کیا ہوتے ہیں؟ دنیا میں اتنی برائیاں کیوں ہیں؟ شیاطین کیا ہوتے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے تو اس نے ابلیس کو کیوں پیدا کیا؟ اللہ تعالیٰ لوگوں کو کیوں تکالیف اٹھانے دیتا ہے؟ خدائے رحمٰن و رحیم کچھ لوگوں کے لیے جہنم کیوں مقدر کر دیتا ہے؟ مجھے آخر یہ سب کچھ بھگتنے کی کیا مجبوری ہے؟

اسلام پر لکھی گئی کتابیں اپنے قارئین سے سرسری طور پر یہ ذکر تو کر دیتی ہیں کہ مسلمان مفکرین نے ان سوالات کے جواب میں کیا سوچا لیکن جو بات ان کہی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آخر وہ کیا فکری کائنات ہے، بیانِ حقیقت کا وہ کون سا اسلوب ہے جو مسلم فکر کو اس کا مخصوص تناظر عطا کرتا ہے اور جس سے ان سوالات کے جواب معنی خیز بن جاتے ہیں۔ اسلام پر ہونے والے یہ مطالعات عموماً مسلم فکر میں پائے جانے والے اختلافات پر زور دیتے ہیں لیکن یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ ان اختلافی مباحث میں ہمیشہ صحیح یا غلط، صواب و ناصواب کی منطق نہیں چلتی۔ فہم کے مختلف تناظر ایک دوسرے سے جدا اس لیے ہوتے ہیں کہ دین کے بنیادی مآخذ کی شرح و تعبیر میں فرق واقع ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ایک مسئلے پر

ایک موقف دوسرے ہر موقف کو لازماً رد کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مذکورہ کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمان مفکرین ان مسائل، مثلاً جبر و قدر کے مسئلے پر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء رہتے تھے۔ لیکن اگر اس مبحث سے متعلق ہر طرح کی کتابوں پر غور سے ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بحث کے سبھی فریق ایک چیز کے متفقہ طور پر قائل ہیں اور وہ کہ اس مسئلے میں حق یہ ہے کہ دونوں جانب حق پایا جاتا ہے، معاملہ بین بین ہے، نہ یہ پوری طرح درست نہ وہ کاملاً غلط اور نادرست۔ جن لوگوں کے ہاں کسی ایک انتہا کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے وہاں بھی اس طرح کے انتہا پسند موقف اکثر ایک عقلی ریاضت کے طور پر تشکیل دیئے گئے ہیں اور ان کو خود ان کے بنیاد گذار مفکر یا اس کے شاگردوں کے ہاتھوں شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ہماری کتاب کئی لحاظ سے ان کتابوں کا جواب کہی جا سکتی ہے جو عام طور پر مغربی قارئین کو اسلام سے متعارف کروانے کے لیے استعمال میں آتی رہی ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں جو معلومات قارئین کی نذر کی ہیں ان سے مقصود یہ رہا ہے کہ وہ تمام خلا پر کیے جا سکیں جو عام طور پر مروج تعارفی کتب میں پائے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں آپ کو ایک پہلو غالب نظر آئے گا۔ لیکن دوسرے پہلو کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ایک آسان کام ہے۔ اس کے لیے عام طور پر دستیاب تعارفی درسی کتب میں سے کسی کا بھی مطالعہ کافی رہے گا یا پھر تاریخ اسلام پر جو تحریریں ملتی ہیں ان میں فراہم کردہ معلومات کے مطابق اسلام پر نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

قارئین کی خدمت میں ایک بات ہم ابتداء ہی میں عرض کر دینا مناسب جانتے ہیں کہ یہ کتاب ''تاریخی معلومات'' سے تہی رکھی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں

ہم اسلام کے تصورِ تاریخ کے بارے میں بھی کچھ گذارشات کریں گے۔اس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ تاریخ کے تنقیدی مطالعے کا جدید رجحان جو معاملات سر فہرست رکھتا ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر اہم ہیں۔تاریخ نویسی کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ ماضی کے واقعات کی معنویت تلاش کرنے کے عمل میں آج کے تصورِ حقیقت کو بنیاد بنایا جائے۔واقعات اسی وقت سمجھ میں آتے ہیں جب انہیں انسان کی نگاہ کے آئینۂ تعبیر میں دیکھا جاتا ہے۔ان میں معنی از خود پیدا نہیں ہوتے۔قرآن اور اسلامی روایت کو ذرا معاصر علمی آراء اور مروّجہ نظریات کی عینک سے پڑھ کر دیکھیے۔ایسا کرتے ہی ان کی وہ ساری اہمیت اور معنویت جو روایتی اسلام میں انہیں حاصل رہی ہے لازماً نظر سے اوجھل ہو جائے گی۔فطری امر ہے کہ بطور مصنفین ہمارا بھی ایک زاویۂ نگاہ ہے۔تعبیرِ حقیقت کے لیے ہماری اپنی عینک ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو شاید ہمیں اس لیے نشانۂ تنقید بنائیں گے کہ ہم نے اسلام کے تصورِ دین کو خود اس کے اپنے اندر یعنی اسلامی تہذیب کے بطن میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے اور اس کے لیے اسلام کی عقلی روایت پر بالعموم اور تصوف پر بالخصوص انحصار کیا ہے۔لیکن وہ ناقدین یہ نہیں دیکھ رہے کہ یہی تو اسلام کے وہ علمی تناظر ہیں جن میں اسلامی روایت کے بارے میں سب سے گہرے اور خود شناسی پر مبنی افکار پائے جاتے ہیں۔مسلمان مفکرین اور اہلِ علم نے بھی تو خود اپنے آپ کو، اپنے دین اور اپنی تہذیب کو سمجھا ہے۔اگر ہم نے ان کے اس فہم کو معتبر نہ جانا تو پھر ہمارے لیے ضروری ٹھہرے گا کہ اس کی جگہ جدید مغربی مفکرین کے افکار و نظریات کو اہم قرار دیں۔اگر ایسا ہوا تو پھر ہم اسلامی روایت کو ان تنقیدی نظریات اور مناہجِ علم کی عینک سے دیکھنے لگیں گے جو مغربی یونیورسٹیوں میں پروان چڑھے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایک اجنبی تناظر اور ایک درآمد شدہ زاویۂ نگاہ کو اسلامی روایت کے اپنے

تناظر پر کیوں ترجیح دی جائے جبکہ یہ اسلامی تناظر وقت کے صدمات جھیل کر زمانے کی کسوٹی پر پورا اترا ہے؟ ہمیں یہ بات سرے سے نا مناسب لگتی ہے کہ کسی منہاج علم کو صرف اس لیے اختیار کر لیا جائے کہ آج کل اس کا چلن زیادہ ہے اور ایک ایسی فکری روایت کے وسائل کو نظر انداز کر دیا جائے جو ہزار سال تاریخ کے بعد بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔

آخر میں ہم ان تمام طلباء کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جو گذشتہ دس سال میں سٹونی بروک میں ہمارے حلقۂ درس میں شامل ہوتے رہے۔ ان کے سوالات، خواہ ذہانت سے کیے گئے ہوں یا اس کے بغیر، ہمارے لیے معاون ہوتے رہے۔ ان کی مسلسل دلچسپی اور سوالات کی صورت میں جاری رہنے والے عملِ تفتیش نے ہمیں مجبور کیے رکھا کہ ہم نے اسلام کے تصورِ دین کے بارے میں، خود اس کی نظر میں اس کی شناخت کے بارے میں جو کچھ سمجھا تھا اس پر بار بار غور و فکر کرتے رہیں اور اسے بیان کرنے کے لیے وہ سانچے اور اسالیب تلاش کریں جن کی افادیت کا اعتراف کیا جائے۔

تعارف

بات ''اسلام'' کی ہو تو بعض اصطلاحات کو کھولنا اور ان کے معنی متعین کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ ''اسلام'' عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں ''اللہ کی مرضی کے سامنے خوئے تسلیم و سرافگندگی''، ''منشائے الٰہی کو مان کر قبول کر لینا'' ۱؎ ''اللہ کی مرضی کے سامنے سر جھکا دینا''۔ اس سے آگے بڑھیے تو اس لفظ کے ایک خاص معنی بھی ہیں۔ اس معنی میں ''اسلام'' عنوان ہے اس دین کا جو قرآن مجید اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قائم ہوا۔ مسلمان وہ ہے جس نے منشائے خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا یا پھر وہ جو دین اسلام کا پیرو کار ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرشتۂ وحی جبرئیل کے وسیلے سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی۔ یہ تو ہوا اسلام کی حکایت کا بنیادی اور سادہ ترین خاکہ۔ آیئے اب اس خاکے میں تفصیلات کا اضافہ کریں۔

قرآن

اسلام کے ماننے والوں کی تعداد آج سو کروڑ کے لگ بھگ ہو گی۔ یہ سوچنا درست نہیں ہو گا کہ سبھی مسلمان اپنے دین کے قیام کی داستان سے شناسائی رکھتے ہیں۔ اکثر مسلمانوں کے لیے تاریخ بطور تاریخ کچھ ایسی دلچسپی کی چیز بھی رہی ہی نہیں۔ تاریخی واقعات اور حوادث کے ضمن میں اہم بات صرف اسقدر ہے کہ ان کے پردے میں اللہ کے افعال ظہور کرتے ہیں۔ ماضی کے وہی واقعات اصل اہمیت رکھتے ہیں جن کا براہ راست اثر انسان کے لمحۂ حاضر پر پڑتا ہو یا پھر ان کا تعلق ان

احوال سے رہا ہو جو انسان کو جہانِ دیگر میں پیش آنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کا نازل ہونا ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت اور عظمت کے سامنے دیگر امور بالکل ماند پڑ جاتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت تاریخی اور سماجی حالات کیا تھے یہ ایک ایسا موضوع ہے جو خصوصی مہارت کا تقاضا کرتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ یہ ایک الگ شعبۂ علم ہے جس میں معدودے چند علماء ہی اختصاص پیدا کرتے ہیں۔ مغربی مورخین نے اگر اس پہلو پر کہیں زیادہ توجہ مبذول کیے رکھی ہے تو اس سے ان کی اپنی پہچان ہو جاتی ہے۔ جدید آدمی کی نظر میں حقیقی کیا ہے اور اہم کیا، اس کا پتہ اسی رویے سے چلتا ہے۔ مسلمانوں کی نگاہ میں قرآن کی اہمیت کیا ہے، اس نکتے کو کھولنے کے لیے البتہ مورخینِ غرب کا روّیہ قطعاً مددگار ثابت نہیں ہوتا۔

اس کتاب کے بڑے حصے میں ہماری کوشش یہ رہے گی کہ قرآنی تعلیمات کے واضح مضمرات کو کھول کر بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قرآن خود اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔ سر دست تو ہمیں قرآن کی ظاہری ہیئت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے کہ ہمارے قارئین کی اکثریت نے غالباً اس کتابِ مجید کو دیکھا تک نہ ہوگا۔ ہاں ترجمۂ قرآن شاید چند قارئین کی نظر سے گزر چکا ہو۔ [۲]

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہم قرآن مجید اور ترجمۂ قرآن کے درمیان فرق قائم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی نظر میں یہ ایک روزمرہ ہے جبکہ عیسوی نکتۂ نظر اس ضمن میں بالکل مختلف بلکہ برعکس ہے۔ مسیحی حضرات کے لیے انجیل بہر صورت انجیل ہی ہوگی خواہ اسے کسی بھی زبان میں تحریر کیا گیا ہو۔ مسلمانوں کے نزدیک کلامِ خداوندی وہ ہے جو ایک مخصوص متعین عربی زبان کے سانچے میں اترا ہے اور اس کی

یہ لسانی ہیئت بھی اتنی ہی لازم ہے جتنے وہ مفاہیم جو اس کے الفاظ کے وسیلے سے ہم تک پہنچائے گئے ہیں۔ سو قرآن تو صرف قرآنِ عربی ہے۔ رہے اس کے ترجمے تو وہ ترجمانِ قرآن تو ہو سکتے ہیں قرآن نہیں ہو سکتے۔ عالم اسلام کی علاقائی زبانوں میں قرآن کے تراجم، بالخصوص فارسی زبان میں تراجم اوائل ہی میں ہو گئے تھے تاہم انہیں جداگانہ کتاب کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں رہی۔ ان کی حیثیت متنِ قرآن کے معانی کی بین السطور شرح و تفسیر اور قرآن فہمی کے امدادی وسائل سے زیادہ نہیں تھی۔

کئی اعتبار سے قرآن کی لسانی ہیئت یعنی عربی زبان میں ہونے کی اہمیت اس کے متن کے معانی سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی آیاتِ قرآنی کے صحیح مدلول اور شرح و تعبیر کے معاملے میں اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ اختلافات ان مناقشوں سے کم نہیں ہیں جو دوسرے ادیان کے ماننے والوں میں اپنے اپنے صحائف کے بارے میں جنم لیتے رہے ہیں۔ اسلام کی فکری تاریخ کے رچاؤ اور گہرائی کا ایک سبب وہ تنوع بھی ہے جو آیاتِ قرآنی کی تفسیر کے ضمن میں نظر آتا ہے۔ مسلمان مفکرین نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ ہر آیتِ قرآنی کے سات مفاہیم ہیں۔ اوّلین مفہوم وہ ہے جسے ہم لغوی مفہوم کہتے ہیں۔ ساتواں اور سب سے گہرا مفہوم صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔ (جو بھی متن قرآن کو توجہ سے بہ نظر غائر پڑھے گا اس پر نبی علیہ السلام کے اس قول کی حکمت از خود آشکارا ہو جائے گی) قرآنی عربی تمثیل و اجمال کی زبان ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر کتنا ہی کچھ سمیٹے ہوئے ہے اور یہ خوبی عربی زبان کے مخصوص کردار اور لسانی ساخت کی مرہونِ احسان ہے۔ فطری بات ہے کہ ایسی ثروت مند اور وسائل ابلاغ

سے مالا مال زبان پڑھتے ہوئے قاری ایک ہی آیت کے معانی کی مختلف سطحوں کا مطالعہ کرتا چلا جائے۔

قرآنی عربی کی گہرائی اور گیرائی نیز مختلف تعبیرات اور معانی کی تہ داری قبول کرنے کی صلاحیت پر نظر کیجیے تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس ایک کتاب نے کیونکر اسلام جیسی عظیم عالمی تہذیب کی صورت گری کا کام انجام دیا۔ اگر متنِ قرآنی کی ہر آیت سے ہر شخص نے صرف ایک ہی مفہوم اخذ کیا ہوتا تو اسلام اس طرح اتنی دور تک کبھی نہ پھیلتا جتنا آج ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے مخاطب سبھی طرح کے لوگ تھے، مردِ سادہ بھی اور ایک تہذیبی رچاؤ اور شائستگی کے حامل اربابِ دانش بھی، گلہ بان بھی اور فلسفی بھی، سائنسدان بھی اور اہلِ فن بھی۔

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنا پیغام بھیجتے ہیں تو اسی زبان میں جو اس کے مخاطبین کی زبان ہوتی ہے۔ ۳؎ وحی جن پر نازل کی جاتی ان کی ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ قرآن ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اہلِ دنیا کے لیے پیامبر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اگر پیغامِ قرآنی دنیا میں ہر ایک تک پہنچانے کے لیے ہے تو پھر قرآن کو ایسی زبان میں خطاب کرنا لازم تھا جسے ہر کس و ناکس سمجھ سکے۔ اسی لیے اسلام فی الواقع بہت تیزی سے دنیا کی تقریباً سبھی تہذیبوں میں پھیلتا چلا گیا۔ چین اور جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر تا بہ سرزمینِ افریقہ و یورپ۔ ان تہذیبوں اور علاقوں کے لوگ طرح طرح کی کتنی ہی زبانیں بولتے تھے۔ ہمارا اشارہ صرف اس زبان کی طرف نہیں جو حرف و صوت میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہ زبان بھی جس میں دل و دماغ کلام کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ اس کا طرزِ کلام اپنی ایک الگ شان

اور خصوصیات رکھتا ہے۔

کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ عربی زبان اشاعتِ اسلام میں روک بنتی ہے۔ یہ بات درست نہیں ۔عربی زبان اسلام کے پھیلنے میں مددگار رہی ہے۔متنِ قرآن تو ایک متعین شے تھی لیکن اس کے معانی میں شرح وتعبیر کے تقاضوں سے سازگاری کی بہت گنجائش تھی۔ وہ لوگ جو عربی سے نابلد تھے ان کے لیے قرآن کا عربی متن پڑھنا اور جاننا ضروری ٹھہرتا تھا اور اس کے بعد وہ اپنے ثقافتی اور لسانی ورثے کے حوالے سے اسے سمجھنے کی سعی کرتے تھے۔ کسی ایک شخص کی شرح وتعبیر کو حتمی حیثیت حاصل نہیں ہے۔نئی نسل نہ تو پچھلوں کے ترجمہ وتفسیر پر کلیتًا انحصار کرسکتی ہے نہ فہمِ متن کے اس معیار ومثال کو نظرانداز کرسکتی ہے جو روایتِ سلف نے قائم کردی ہے۔ ہر مسلمان کو اپنے صحیفے سے اپنا تعلق خود قائم کرنا ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ اخلاص مسلمان کو لازم تھا کہ وہ خطاب وکلام کی اس عربی کائنات میں اپنی جگہ بنائے، وہ فضا جوان کے لیے کائناتِ ربانی ہے۔

قرآنِ عربی اگر ایک طرف مدارج واسالیبِ فہم میں تنوع کا مؤید ہے تو دوسری جانب اس سے خارجی ہیئت کی یکسانیت ویک رنگی کی پرورش بھی ہوتی ہے۔تمام مسلمان ایک ہی صحیفے کی اسی ایک زبان میں تلاوت کرتے ہیں۔ یومیہ فرض نمازیں بھی وہ کم بیش یکساں انداز میں ادا کرتے ہیں۔وحی کے ذریعے اللہ کے نازل کردہ کلام کو اسلام میں جو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر تلاوت ہی وہ سب سے بڑا وسیلہ ہے جس کے سہارے انسان کلمۃ اللہ سے شریکِ کلام ہوتا ہے۔تفہیم کا عمل ثانوی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ کلامِ الٰہی کے معانی کی گہرائیوں پر مکمل عبور کیسے حاصل ہوسکتا ہے! سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ کلامِ ربانی کو

قبول کر کے محفوظ کیا جائے۔ اس کی عربی ہیئت اہم تر ہے۔ یہ صورت و ہیئت آپ تک پہنچے گی تبھی تو آپ اس سے کچھ حاصل کر پائیں گے۔

قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہوتا، معانیِ قرآن کی ترجمانی سے عبارت ہوتا ہے۔ انگریزی میں قرآن کے درجنوں تراجم تو رہے ہوں گے۔ ہر ترجمہ اپنے مترجم کے فہمِ قرآن کا آئینہ دار ہے، ہر ترجمہ دوسرے ترجمے سے خاصا مختلف ہے اور ان میں سے کوئی ترجمہ بھی قرآنِ مجید نہیں ہے۔ کلامِ خداوندی وہی ایک قرآن ہے خواہ اس کے ترجمان کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ جتنے قاری اتنے ترجمان۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسلام اختلاف آراء و تعبیرات کا ایک کھڑاگ ہے۔ ہر شخص کی اپنی ڈفلی اپنا راگ۔ بحیثیت مجموعی اسلام میں ارکانِ ایمان اور اعمالِ شرعی کے بارے میں دوسرے ادیان، مثلاً عیسائیت کے مقابلے میں کہیں کم اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ وہ حضرات جو تفسیرِ قرآن کا بیڑا اٹھانا چاہتے ہوں انہیں قرآن کے جہانِ کلام میں داخل ہونے کے لیے بہت سے علوم کی تربیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ مزید براں اس حصولِ علم کے ساتھ ساتھ انہیں قرآن کی تجسیم یعنی تلاوتِ متن اور عباداتِ شرعی کے سانچے میں بھی ڈھلنا ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآن کی ہدایت کے مطابق قرآن سے اپنا تعلق پیدا کرنے کوشش کرتے ہیں ان کی قلبِ ماہیت کرنے کی قوت قرآن میں واضح طور پر موجود ہے۔ یہی اسلام ہے یعنی قرآن کے وسیلے سے معلوم ہونے والی منشائے خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔ لیکن یہ تسلیم و قبول محض ارادی نہیں ہوتا۔ قرآن لوگوں میں ان کے وجود کی سطح پر بھی یہ سرافگندگی اور خوئے تسلیم استوار کر دیتا ہے، یوں کہ قرآن کا اساسی پیغام ان کا سامانِ ہستی بن کر جھلکنے لگتا ہے۔ پھر خواہ ان کی تعبیرات کتنی ہی ''نئی اور انوکھی''

کیوں نہ ہوں۔

واضح رہے کہ ہم تعبیراتِ قرآن کا ذکر ایک خاص سیاق وسباق میں کر رہے ہیں یعنی اسلام کے ایمان وعمل کے دائرے کے اندر۔اسلام سے مخلص نہ ہونے کے باوجود بہت سے مغربی اہلِ علم نے بھی قرآن کے متن کی اپنے طور پر شرح وتعبیر کی ہے۔ان تصانیف سے غیر مسلموں کو قرآن فہمی میں مدد ملنے کی امید بہت کم ہے۔وہ قرآن جو مسلمانوں پر کھلتا ہے اس کی جھلک ان تعبیرات میں نہیں ملتی۔

وہ عربی کتاب جس کو قرآن کہا جاتا ہے، ضخامت میں تقریباً عہدنامہ جدید کے برابر ہے۔مطبوعہ مصحف اکثر ۲۰۰ سے ۴۰۰ صفحات کے درمیان ہوتا ہے۔عبرانی انجیل اور عہدنامۂ جدید کے برعکس، قرآن ایک ہی ہستی کی زبان سے صادر ہوا جس نے فرشتۂ وحی جبرئیل سے سن کر اسے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنایا۔یہودی اور مسیحی مصاحف بہت سی کتب کا مجموعہ ہیں، ان کے مصنف انسان تھے اور ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ان کتب کے سرچشمۂ وحی سے ماخوذ ہونے پر بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔یہ مان بھی لیجیے کہ انجیل کی مختلف کتابیں الہامی کتب ہیں تب بھی یہ بات اپنی جگہ رہے گی کہ یہ کتب مختلف لوگوں کو الہام کی گئیں جو نہ تو ایک جگہ کے رہنے والے تھے نہ ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئے۔

قرآن چھوٹی بڑی سورتوں کا مجموعہ ہے۔سورت کے لفظی معنی ہیں "باڑ، احاطہ، کسی تعمیر کا ایک حصہ"۔مختصر ترین سورت میں دس الفاظ ہیں اور طویل ترین سورت جو متنِ قرآن میں دوسرے نمبر پر ہے ۶۱۰۰ الفاظ پر مشتمل ہے۔پہلی سورت "الفاتحہ" نسبتاً چھوٹی ہے (۲۵ الفاظ)۔دوسری سورت سے آگے بڑھیے تو سورتوں کی لمبائی تدریجاً کم ہوتی جاتی ہے۔البتہ یہ کوئی مقررہ قاعدہ نہیں ہے۔آخری

ساٹھ سورتیں مجموعی طور پر اتنی لمبی ہوں گی جتنی سورہ بقرہ۔

ہر سورت مختصر حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں ہر ایک کو آیت کہا جاتا ہے۔ لمبی آیات میں سے بعض تو چھوٹی سورتوں سے بھی زیادہ طویل ہیں۔ انگریزی میں آیت کو عموماً verse کے لفظ سے ترجمہ میں ظاہر کیا جاتا ہے تاہم لفظی معنی میں اس کا مطلب ہے sign ''نشانی یا علامت''۔ یہ لفظ نہایت اہم ہے لہٰذا ہم اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

قرآن کے مشمولات کو پڑھ کر عبرانی انجیل اور عہدنامۂ جدید کے بعض حصوں کی یاد آتی ہے۔ قرآن میں بھی انہی بہت سی شخصیات کا ذکر ہے اور ان کے بارے میں بیان کردہ قصصِ قرآنی کا مقصود بھی پڑھنے والوں کے لیے نصیحت و عبرت آموزی ہے۔ ماضی کی عظیم اور مثالی انسانی ہستیوں کو نبی کا نام دیا گیا ہے اور ان میں سے اہم ترین کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ ان ہستیوں میں آدم، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا نام تو دوسرے تمام حضرات سے زیادہ مرتبہ مذکور ہوا ہے۔ ان کے ساتھ فرعون کا ذکر بھی عموماً کیا گیا ہے جو قرآن میں انسانی شر و فساد کے مستقل نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قرآن تفصیل سے بتاتا ہے کہ نبیوں کے پیروکاروں بالخصوص یہود و نصاریٰ نے کس طرح اپنے انبیاء کے پیام و ہدایت کے مطابق بھی زندگی گزاری اور اس ہدایتِ نبوی سے روگردانی بھی کی۔ اللہ کی پسندیدہ زندگی کیسے گزاری جاتی ہے؟ قرآن اس کے بارے میں احکامات دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور محتاجوں کی خبرگیری کی تلقین کرتا ہے۔ انسانوں کے باہمی رشتے ناطے قرآن میں بہت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں نیز قوانینِ وراثت، نکاح و طلاق کے معاملات

جن کو پڑھ کر عبرانی انجیل کے بعض حصے ذہن میں ابھرتے ہیں۔عہدنامۂ جدید کے لیے البتہ یہ باتیں سرے سے اجنبی ہیں۔قرآن لوگوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ احکامِ حق کو صرف اور صرف اللہ کے لیے قبول کریں اور ان کی بجا آوری میں دنیاوی اغراض کو مدنظر نہ رکھیں۔پیغامِ حق کو رد کرنے والوں کے لیے قرآن میں نارِ جہنم کی وعید ہے اور فرمانِ خداوندی کو قبول کرنے والوں کے لیے جنت کی نعمتوں اور فلاح کا وعدہ۔یہودی اور عیسوی انجیل کے مقابلے میں قرآن اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے اور بار بار ذکر کرتا ہے۔موضوع خواہ کچھ بھی ہو قرآن ہر بات کو لوٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے چاہے اس کے لیے وہ کلام کے درمیان ایسے فقرے شامل کرتا چلا جائے جن میں اللہ تعالیٰ کو اس کے کسی ایک نام یا کئی اسمائے الٰہی سے یاد کیا گیا ہو مثلاً ''واللہ علیم قدیر''۔''وکان اللہ عزیزاً حکیما''

مغربیوں کے لیے قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کو جانچنا اور اس کی قدر پہچاننا ایک نہایت ہی دشوار کام ہے۔ترجمے کے حوالے سے تو یہ مشکلات خاص طور پر بڑھ جاتی ہیں۔وہ لوگ جنھوں نے سالہا سال عربی زبان کی تحصیل میں صرف کیے ہیں کہ قرآن کو اس کی زبان میں پڑھ سکیں ان کو بھی بسا اوقات قرآن غیر منطقی، تنظیم سے عاری اور نا درست معلوم ہوتا ہے۔بایں ہمہ نہ صرف اسلامی تہذیب اس بات کی وافر شہادت فراہم کرتی ہے بلکہ عظیم فلسفیوں، متکلمین اور شعراء کی تفاسیر اور شرح و تعبیر بھی اس پر دال ہیں کہ دراصل مسئلہ متنِ قرآن کا نہیں پڑھنے والے کا ہے۔یہ البتہ درست ہے کہ بلاشبہ آج تک صفحۂ قرطاس پر ثبت ہونے والی کوئی تحریر ایسی غیر معمولی نوعیت کی نہیں رہی۔یہ کتاب ایک غیر معمولی کتاب ہے۔لوگوں کے خیال میں ایک کتاب کو جو کچھ ہونا چاہیے قرآن اس سے مختلف ہے۔اسی لیے اس

سے ایسے لوگوں کی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔

نو آبادیاتی استعماری نظام کے عروج کے زمانے میں جب سماجی ڈارونیت؎ نے اہلِ مغرب کی ایک بڑی تعداد کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی تھی کہ مغرب والے اوجِ کمالِ انسانی کے مظہر ہیں، بہت سے اہلِ علم مسلمانوں کو صرف اس لیے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کے خیال میں قرآن ایک قابلِ احترام صحیفہ تھا۔ بزعمِ خویش یہ مغربی لوگ ارتقائے انسانی کی جن بلندیوں پر فائز تھے وہاں سے قرآن انہیں حکایاتِ کہن اور اوہام و خرافات کا ایک بے سلیقہ ملغوبہ نظر آتا تھا۔

مغرب کی علمی دنیا کا بڑا حصہ اب ثقافتی برتری کا یہ مفروضہ ترک کر چکا ہے اور قرآن پر اس اعتبار سے نگاہ کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے جوہر میں یکتا ہے۔ قرآن کے بارے میں پچاس سال پہلے کے مقابلے میں آج مثبت تحریریں کہیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ تاہم اب بھی ایسی بڑی بڑی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں جو غیر مسلموں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جنہیں عربی زبان اور علومِ اسلامی کی پوری مہارت میسر نہیں ہے، قرآن کی قدر شناسی میں آڑے آجاتی ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تو یہ مہارت بھی کتابِ مجید تک رسائی کی ضمانت فراہم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

بہت سے مسلمان، خاص طور پر وہ جن کی مادری زبان عربی ہے، کچھ یوں سمجھتے ہیں گویا قرآن پر ان کا حقِ ملکیت ہو۔ تاہم اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص کو قرآن کا خاصا حصہ یاد تو ہوتا ہے لیکن اس تصورِ کائنات کا اسے سرے سے کوئی شعور نہیں ہوتا جو قرآن کے لفظ لفظ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قرآن کا منقلب کر دینے والا اثر قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس کرتا

ہو۔ہاں اس سے یہ ضرور ہوگا کہ وہ قرآن کے معانی کو اس پیرائے میں ظاہر کرنے سے قاصر ہوگا جو اس کی اپنی روایت سے ہم آہنگ ہو۔

قرآنِ مجید کا تصورِ کائنات وہ بنیادی رکاوٹ ہے جو اس کتابِ مجید کے فہم کے راستے میں اہلِ مغرب کے لیے حائل ہو جاتی ہے۔یہاں تک تو درست ہے کہ قرآن دنیا و مافیہا کے بارے میں جو نقطۂ نظر رکھتا ہے وہ یہودی اور عیسوی تصورِ کائنات دونوں سے ایک قریبی تعلق رکھتا ہے مگر دنیائے جدید کے اکثر لوگ یہودی اور عیسوی تصورِ کائنات سے بھی اتنے ہی نابلد ہیں جتنے اسلام کے تناظر سے۔محض کلیسا،صومعہ اور مسجد میں عبادت کے لیے چلے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب آپ گرد و پیش کی دنیا کو اپنے معاصر لادین لوگوں سے کسی الگ انداز میں دیکھنے لگے ہیں۔ ہماری تہذیبی زندگی میں جو اندازِ فکر غالب ہے اسے ہم عبادت گاہوں میں نہیں سیکھتے۔اس کی ترویج تعلیمی اداروں اور ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے ہوتی ہے۔ہم لاکھ کہا کریں کہ ہماری تعلیم سائنسی،غیر جانبدار اور تعصّبات سے آزاد ہے مگر یہ حکم لگانا بھی خود ایک حد درجہ جانبداری کی بات ہے۔ ہمارے معاصرین میں سے کتنے ہی مفکر اور سماجی تنقید کے ماہرین ہمیں یہی بتا رہے ہیں۔[۵]

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ ترجمۂ قرآن پڑھنے کی کوشش کریں جنہیں اسلام کے تصورِ کائنات سے کوئی علاقہ نہیں ہے تو انہیں اس میں اپنے تعصّبات ہی کی تائید ملتی ہے خواہ یہ تعصّبات جو بھی رہے ہوں۔قرآن اس کائنات کے بارے میں جو نقطۂ نظر رکھتا ہے اس تک صحیح معنوں میں رسائی تبھی ممکن ہے جب آپ کو اس فکری پس منظر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جو اس کتاب میں نفوذ کیے ہوئے ہے۔اور یہ اندازِ فکر ہمارے لیے سراسر نامانوس ہے کیونکہ ہمیں اپنی تمدنی زندگی میں

اور جدید تعلیم کے تحت جس ڈھب سے سوچنا سکھایا جاتا ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سب لوگ جنھیں ہم ''ذہنِ جدید'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں قرآن میں سے کچھ بھی سمجھنے جاننے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ اس زمرے میں تو عملاً سبھی انگریزی بولنے والے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان شامل ہو جاتے ہیں۔ہم یہ بھی نہیں کہ رہے کہ انہیں قرآن کے موجودہ تراجم پڑھنے کی زحمت نہیں کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں پہلی بات یہ مدنظر رہے کہ اگر قرآن کا ترجمہ ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مترجم نے قرآن کو جدید اسالیبِ فکر کے دائرے میں لانے کا کام سر انجام دینے کی سعی کی ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ اسی کارن معانیِ متن کو بری طرح مسخ کر ڈالا ہو۔بہر کیف اگر آپ عربی نہیں جانتے اور اسلام سے شناسائی حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کو یہ کتاب لازماً ترجمے ہی میں پڑھنا ہوگی۔ہم نے اس ضمن میں قاعدہ یہ دیکھا ہے کہ ساری کتاب کو ترتیب وار پڑھنے کی کوشش کرنے کے مقابلے میں آپ کہیں سے بھی اسے کھول کر چند صفحات پڑھ لیں اور پھر آئندہ دوسرے کسی مقام کا مطالعہ کریں۔

قرآن کا تصورِ کائنات اور عربی زبان ایک دوسرے سے قریبی تعلق میں جڑے ہوئے ہیں۔سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان آرامی تھی۔آرامی اور عبرانی زبانوں کی طرح عربی بھی سامی زبان ہے۔سامی زبانوں کی داخلی منطق غیر سامی یعنی ہندیورپی زبانوں سے بہت مختلف ہے۔موخرالذکر زبانوں کے زمرے میں انگریزی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی شامل ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر لفظ کا ایک مادہ یا جڑ بنیاد ہوتی ہے جو عام طور پر تین حروف پر مشتمل ہوتی ہے۔اس سہ حرفی بنیاد پر تعمیر اٹھاتے ہوئے سینکڑوں لفظوں کی صورت گری کی جاسکتی ہے خواہ معمول کے

طور پر ان میں سے چند سو لفظ ہی عملاً استعمال میں لائے جائیں۔ تصورات کی معنوی جہت پر روشنی ڈالنے کے لیے ہمیں آگے چل کر اکثر عربی الفاظ کے بارے میں بحث کرنا ہوگی۔ اس بحث کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں ہوگا کہ ہم معانی کی اس وسعت اور گہرائی کی طرف اشارہ کر سکیں جو ان الفاظ نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہے، نہ انگریزی میں عربی الفاظ کو ترجمہ کرنے کی مشکلات بیان ہو سکیں گی نہ ہی عربی زبان کے الفاظ میں پایا جانے والا وہ باہمی ربط کھل کر سامنے آ سکے گا جو اصل عربی میں از خود واضح ہو جاتا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا محمدؐ کی حیاتِ مبارکہ کا بیان بارہا کیا گیا ہے۔[۶] مغربی قارئین کو سیرت کی جو تفاصیل میسر ہیں وہ سب کی سب کم ہی مسلمانوں کے علم میں ہوں گی۔ وہ قارئین جو مسیحی پس منظر رکھتے ہیں ان کے لیے ایک نکتہ پیشِ نظر رکھنا مناسب ہوگا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح کا اناجیل میں جو بیان ملتا ہے وہ عیسائیت کے لیے ایمانیات کے ایک بڑے حصے کا کردار ادا کرتا ہے۔ جبکہ اسلام میں قرآن کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ رسولِ خداؐ کو مسلمانوں کی دینی زندگی میں بے پناہ اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی یہ اہمیت اس تعلق کے حوالے سے ہے جو کلام اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان قائم ہے۔ اس ضمن میں ایف۔ ای۔ پیٹرز نے اپنے مندرجہ ذیل تبصرے میں یہی نکتہ ہمیں یاد دلایا ہے جس کی طرف کئی دوسرے مصنفین بھی اشارہ کر چکے ہیں۔[۷]

ایک عیسائی کو "عیسیٰ مسیح کی بشارتوں" کا مطالعہ کیے بنا چارہ نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا کارِ مقدس اسی میں ظاہر ہوا ہے۔ مسلمان اگر رسولِ خداؐ کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو محض ایک نیک عمل کے طور پر۔ وحیِ خداوندی کہیں اور واقع ہے۔

سیدنا محمدؐ ۵۷۰ عیسوی میں عرب کے شہر مکہ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اہلِ مکہ کا تعلق مختلف عرب قبائل سے تھا جن کے کچھ خانوادے ہنوز بادیہ نشین تھے۔ شہر تجارتی مرکز کی حیثیت سے بھی اہم تھا مگر اہم تر بات یہ تھی کہ یہاں کعبہ کے نام سے ایک قدیم عبادت گاہ واقع تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی بنیاد سیدنا آدمؑ نے رکھی تھی اور اس کی تعمیر نو سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ سیدنا محمدؐ

کے زمانے میں کعبہ بتوں کی آماجگاہ بن چکا تھا جہاں عرب قبائل کے خداؤں کے بہت سے بت رکھے ہوئے تھے۔سال کے چار مہینے ''مقدس مہینے'' قرار دیئے گئے تھے۔ان مہینوں میں قبائل کی باہمی جنگ ممنوع تھی۔

عربوں کے قدیم اندازِ جنگ اور آج کی جنگوں میں کوئی مشابہت نہیں ہے سوائے اس کے کہ ان جنگوں میں گاہ گاہ کچھ لوگ کام آجاتے تھے۔ان جنگوں سے غرض اصل میں یہ تھی کہ ان کے تمدن میں مردانگی کا جوہر باقی رہے اور مال و دولت وقفے وقفے سے ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہے۔پھر اس طرح ہر قبیلے کے امتیازی خصائص اور موروثی خوبیوں کو بھی جلا ملتی رہتی تھی۔جنگوں میں بعض اوقات صاحبانِ شمشیر کی بجائے قبیلے کے شاعر مردمیدان کی حیثیت اختیار کر جاتے تھے۔جنگ کی داستانوں میں بارہا ایسے قصے بھی دیکھے گئے کہ قبائل کے جنگجو لڑائی کے لیے صف آراء ہوئے اور پھر صرف اس لیے میدان جنگ سے منہ موڑ گئے کہ کسی عظیم شاعر نے ان کی ہجو کر کے انہیں شرمسار کر ڈالا۔

سیدنا محمدؐ کے والد ان کی ولادت سے قبل فوت ہو چکے تھے۔چھ سال کی عمر میں والدہ بھی چل بسیں۔آپؐ کی پرورش دوسرے اعزہ نے کی۔اہلِ مکہ کی اکثریت کی طرح آپؐ کو بھی کچھ مدت کے لیے ایک بدو قبیلے میں رکھا گیا تاکہ آپ خالص عربی زبان اور عاداتِ عرب اخذ کر سکیں۔بڑے ہو کر آپؐ اپنے لوگوں میں ایک معزز فرد کے طور پر ابھرے۔آپ کی صداقت و امانت اور شرافت معروف تھی۔تجارت سے بھی شغف رکھا اور تجارتی قافلوں کے ساتھ شام کے سفر کیے۔ آپؐ کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی کہ آپؐ کے اموالِ تجارت کی مالکہ نے آپؐ کو شادی کی تجویز پیش کی۔حضرت خدیجہؓ نسبتاً زیادہ مالدار تھیں،بیوہ تھیں اور

چالیس کے سن میں تھیں۔ آپ ؐ نے تجویز قبول کی اور آئندہ ۲۵ سال حضرت خدیجہؓ کی وفات تک ان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کی۔

آنحضرت ؐ عرب کے مقامی قبائل کے مذہبی رسوم سے مطمئن نہ تھے۔ آپ ؐ کی ترجیح قدیم دینِ عرب کے توحید پرستوں کا وہ سلسلہ تھا جس کے ماننے والے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور حنیف (جمع: حنفاء) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آپ ؐ پہاڑوں میں واقع ایک غار میں جا کر بیٹھتے اور تنہائی میں غور فرمایا کرتے۔ اسی غار میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے آگے چل کر تاریخ عالم میں دور رس اور بھرپور اثرات ثبت کرنا تھے۔ اس وقت آپ کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔ وہ عمر جس میں قرآن کے مطابق انسان اپنے پورے بلوغ اور پختگی کو پہنچتا ہے۔ ''حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ''۸ (۴۶:۱۵) (یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچا چالیس برس کو) آپ ؐ غار حرا میں غور و فکر میں مشغول تھے کہ ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس فرشتے نے انہیں بتایا کہ اللہ نے ان کو اپنا رسول بنایا ہے۔ قرآن کے پہلے چند کلمات کی وحی بھی وہیں نازل ہوئی۔

فرشتہ لوٹ کر نہ آیا تو آنحضرت ؐ کو تشویش ہونے لگی اور کچھ عرصہ اسی پریشانی میں گزرا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ ؐ کو سہارا دیا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا شوہر اس قدر راست فکر ہے کہ اس کے ذہن پر اثر ممکن نہیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ فرشتۂ وحی کے ظاہر نہ ہونے سے آپ کی ایسی حالت ہوئی کہ پہاڑ سے خود کو گرا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ آخر کار فرشتہ پھر ظاہر ہوا اور پھر آنحضرت ؐ کو پیغام دیا کہ آپ ؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد فرشتہ متواتر پیامِ خداوندی لے کر آتا رہا۔ کسی قدر گھبراہٹ کے بعد آنحضرت ؐ نے فرمانِ خداوندی کو قبول کر لیا اور

اعلانِ نبوت کرنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ آپؐ کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کی صداقت لوگوں کے دل میں گھر کرتی گئی۔ آپؐ جو اِن سے کہتے وہ صاف اور سادہ الفاظ میں یوں تھا: خدا نے مجھے اس لیے چنا ہے کہ تم لوگوں کو یوم الحساب کی وعید سناؤں، خدا کا حکم مانو اور اپنے طور طریقے درست کر لو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان خدا ہی کی عبادت کرے کہ عبادت کے لائق وہی ہے، کچھ مراسم کی پابندی کرے اور اخلاقی قیود پر عمل کرے، اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور سماجی زندگی میں بھی۔

آج بہت سے لوگوں کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ یہ پیغام کیونکر لوگوں پر اثر انداز ہوا ہو گا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سیدنا محمدؐ اس کی ایک دلیل بھی ساتھ پیش کرتے تھے جس کے سامنے ان کے زمانے کے بہت سے لوگ زیر ہو جاتے تھے۔ پیغامِ خداوندی کی زبان یعنی خود قرآنِ مجید جس کی آیات آپؐ کی رحلت تک وقفے وقفے سے نازل ہوتی رہیں۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں شاعری تلوار سے زیادہ کارگر ہو قرآن کے زبان و بیان کا دبدبہ اور ہیبت یقیناً سننے والوں کو اس کی حقیقت کا قائل کر لیتا ہو گا۔ یاد رہے کہ قرآن کو شاعری نہیں سمجھا جاتا تھا اگرچہ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں بھرپور شعریت ملتی ہے۔ تاہم اس کو جو بھی سنتا بے ساختہ کہہ اٹھتا کہ قرآن کی زبان میں ایک غیر معمولی زور اور تاثیر ہے۔ یہ چیز قرآن کی ان آیات کے بارے میں خاص طور پر درست ہے جو آنحضرتؐ کے زمانۂ نبوت کے ابتدائی زمانے میں آپؐ پر نازل کی گئیں۔ قرآن آنحضرتؐ کی سب سے بڑی دلیل تھا کیونکہ یہ کتاب، فی الحقیقت، ایک زندہ معجزہ تھی۔

کچھ بھی کہیے آنحضرتؐ تھے تو نوعِ انسانی میں سے۔انہیں سبھی پہلے سے جانتے تھے۔ان کی شہرت ایک اچھے شریف آدمی کی تھی لیکن اس وقت تک ان میں کوئی بہت خاص بات نہیں تھی۔آپؐ مکہ کے عام باشندوں میں سے تھے گو آپؐ کی امانت اوردیانت کی وجہ سے آپؐ کو''الامین'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔اپنے شہر کے بہت سے لوگوں کی مانند آپؐ بھی عرب قبائل کی خالص عربی بولتے تھے۔مکہ کے عوام میں سے ایک شخص کی زبان پر اچانک ایک روز ایک ایسا کلام جاری ہو جاتا ہے جس کے حسن وشکوہِ بیان اور اثر انگیزی کا ٹھکانا نہ تھا۔صرف یہی نہیں کہ عربوں نے ایسی زبان کبھی سنی نہ تھی۔اس کا پیغام بھی انہیں کچھ ایسی باتیں یاد دلا رہا تھا جو اِن کے کان میں پڑ چکی تھیں۔یادر ہے کہ یہ اس معاشرے کی بات ہو رہی ہے جس میں زورِبیان اور قوت واقتدار کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

عرب خود کو آلِ اسمٰعیلؑ قرار دیتے تھے جو اولاد ابراہیمؑ میں سے تھے۔حضرت ابراہیمؑ کو بھی عرب پرانے انبیاء میں شمار کرتے تھے لیکن ان کا پیغام کیا تھا یہ بات شاید چند ہی لوگوں پر واضح رہی ہو۔علاوہ ازیں ان کے گردوپیش میں یہودی اور نصرانی بھی آباد تھے۔ان تینوں گروہوں کے لیے آنحضرتؐ کی کہی ہوئی باتیں نامانوس نہیں تھیں۔قرآن میں بارہا وہ اعتراضات مذکور ہوئے ہیں جو مقامی لوگوں کی طرف سے اس نئے پیغامِ ربانی پر کیے جا رہے تھے۔یہی لوگ تھے جو قرآن کو''گزرے ہوئے لوگوں کے افسانے''اور''پرانے وقتوں کی قصہ کہانیاں'' کا نام دیتے تھے۔بالفاظِ دیگر اُن کا ردِعمل یہ تھا کہ بھئی ہم نے یہ سب پہلے بھی سن رکھا ہے اور یہ سب کچھ بے کار کی باتیں ہیں:

یقول الذین کفروا ان ھذآ الآ اساطیر الاوّلین

(٦:٢٥)

کہتے ہیں وہ منکر، یہ کچھ نہیں مگر نقلیں ہیں اگلوں کی۔

لقد وعدنا ھذا نحن و ابآؤنا من قبل ان ھذآ الآ

اساطیر الاوّلین (٢٧:٦٨)

وعدہ مل چکا ہے اس کا ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو آگے سے اور کچھ نہیں، یہ نقلیں ہیں اگلوں کی۔

اوّلین مسلمانوں کا دل اسلام پر جم گیا تھا تو اس کی تہ میں کئی باتیں تھی۔ آنحضرتؐ کا ان کے درمیان رہتے ہوئے یوں یکا یک بدل جانا، ان کی زبان و بیان کا ناقابلِ یقین شکوہ، فصاحت و بلاغت اور یہ احساس کہ انکے لائے ہوئے پیغام سے تو ہم ہمیشہ سے آگاہ تھے بس نہ جانے کیوں اس سے غافل ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ شاید یہ سب باتیں دنیائے جدید میں رہنے والے ہم لوگوں کی بے جواز نفسیات بازی کے مترادف ہیں اس لیے کہ آج کے انسان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ یہ جان سکے کہ چودہ سو سال پہلے زندگی کرنے والے ان لوگوں کے دل و دماغ پر آخر کیا گزری تھی؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہمیں یہ تک پتا نہیں ہوتا کہ ہمارے برابر کا پڑوسی کیا سوچ رہا ہے؟ سو اس تبدیلی پر بات کرتے ہوئے یہی سب سے بہتر طریقہ ہے کہ اچھے مسلمانوں کی طرح اسے ہدایتِ ربانی اور اس سے جنم لینے والے ایمانِ انسانی سے منسوب کریں۔ مسلمان اہلِ علم اکثر ایمان کی تعریف انہی الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''ایمان ایک نور ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اس کے دل میں یہ نور ڈال دیتا ہے''۔ بنیادی نکتہ یہی ہے کہ اس راز کو کھولنا ممکن نہیں۔

مکہ کے زور آور لوگوں نے شروع میں تو یہ جانا کہ آنحضرتؐ کے دماغ میں خلل آ گیا ہے لیکن پھر جب ان کے اپنے دوست اور عزیز رشتے دار بھی اس چھوٹے سے گروہِ مسلمین میں شامل ہونے لگے تو ان کو فکر ہوئی اور کچھ وقت گزرا تو وہ ان کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ پھر ہر اس ستم سے ان کا ہاتھ نہ رکا جس سے وہ اسلام لانے والوں کی زندگی میں دکھ گھول سکتے تھے۔ آنحضرتؐ اور آپؐ کے اصحاب کو آزمائشوں اور تکالیف سے گزرنا پڑا۔

سن ۶۲۲ء میں حالات میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ مکہ کے شمال میں تقریباً دو سو میل کی مسافت پر واقع یثرب کے شہر سے ایک وفد آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ اپنے باہمی جنگ و جدال کے خاتمے کے لیے انہیں ایک صلح کروانے والے کی تلاش تھی اور آنحضرتؐ کی فراست اور دانائی کے بارے میں انہیں اچھی خبریں سننے کو ملی تھیں۔ یہ لوگ آپ کی نبوت کو قبول کرنے پر تیار تھے اگر آپ ان کے شہر میں بطور حاکم کے تشریف لے جائیں۔ اسی اثناء میں مکہ کے رئیس اس فیصلے پر پہنچ چکے تھے کہ اب محمدؐ کی تعلیمات چونکہ ان کے لگے بندھے نظام کے لیے روز افزوں خطرہ بن چکی ہیں لہٰذا ان کو قتل کر دیا جائے۔ ان کی سازش ابھی عمل میں نہیں آئی تھی کہ چند گھنٹے قبل ہی آپؐ خاموشی سے حضرت ابو بکرؓ کو ہمراہ لے کر شہر سے نکل آئے۔ حضرت ابو بکرؓ آپؐ کے قریبی صحابی تھے اور آگے چل کر آپ کو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے آپؐ کا سیاسی منصب بھی سنبھالنا تھا۔ تعاقب سے محفوظ رہنے کے لیے دونوں حضرات نے ایک لمبا راستہ اختیار کیا اور دس دن میں یثرب پہنچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یثرب ''مدینۃ النبی'' کہلانے لگا، ''دیارِ نبی'' یا صرف ''المدینہ'' یعنی وہ شہر۔

آپؐ کا مدینہ منتقل ہونا ہجرت کہلایا۔ یہ آپؐ کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ اس دن سے لے کر چند معمولی واقعات کے علاوہ اسلام ترقی کرتا رہا۔ اسلام اب مستحکم ہو چکا تھا۔ ایک نئی تہذیب جنم لے چکی تھی۔ اسی لیے ہجرت کو اسلامی تقویم کا پہلا سال شمار کیا جاتا ہے۔ ہم اپنی تحریر میں دونوں تاریخیں، عیسوی اور ہجری، درج کریں گے۔ سو ۶۳۲ء/۱۰ ہجری میں آپؐ کا سانحۂ رحلت پیش آیا، قسطنطنیہ (جس کا نام جلد ہی استنبول ہو گیا) ۱۴۵۳ء/۸۵۷ھ میں ترکوں کے قبضے میں آیا، نپولین کا مصر پر حملہ جس سے شمالی افریقہ میں نو آبادیاتی دور کا آغاز ہوا، ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ میں عمل میں آیا۔

مدینہ میں آپؐ کے دس سال اسلام کے استحکام کا زمانہ تھا۔ آپؐ کی زندگی کے آخری دور میں مکہ بغیر قطرۂ خون گرائے مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ ''شاعری'' نے ایک اور جنگ جیت لی تھی اور سارا جزیرہ نمائے عرب حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

مدنی دور میں اسلام کو جو استحکام حاصل ہوا تو اس سے ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ اب قرآن کی جو آیات نازل ہو رہی تھیں ان میں زور ان عملی اور ظاہری احکامات پر تھا جو حکمتِ خداوندی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے ضروری تھے۔ انجامِ بد کی وعید اور سعادتِ ابدی کا وعدہ ان آیات کا اوّلین موضوع نہ تھا۔ آنحضرتؐ سب مسلمانوں کے نبی و رسول بھی تھے اور سلطان بھی، قاضی بھی تھے اور ہدایتِ روحانی کا مرکز بھی۔ سو آپؐ کے پاس وحی آتی اور آپ لوگوں تک پہنچاتے، سماجی اور سیاسی معاملات میں احکامات صادر کرتے، جھگڑے تنازعہ کا فیصلہ کرتے، قانونِ خداوندی سے سرکشی کرنے والوں کے لیے سزا یا درگزر کا اعلان کرتے اور لوگوں کی رہنمائی

فرماتے کہ قربِ خداوندی کے حصول کے لیے ہر شخص کو ذاتی طور پر کیا کرنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ مدینے کے مسلمان اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔ان احکامات کی شرح و تفصیل آنحضرتؐ فرماتے تھے۔بعد کے زمانوں میں اس دور کو اسلام کا عہدِ زریں کہ کر یاد کیا جانے لگا۔رسولِ خداؐ تشریف رکھتے تھے سو، الحق تک رسائی آسان تھی۔آراء کا اختلاف وجود نہ رکھتا تھا کہ آنحضرتؐ خود قرآن کے معانی واضح کر دیتے تھے۔ایک طرف اگر قرآن کا متن لکھا جاتا تھا، اس کی آیات یاد کی جاتی تھیں تو دوسری طرف لوگ آنحضرتؐ کی باتیں اور آپ کے طریقے بھی محفوظ کرتے تھے۔آپؐ کا کہا ہوا اور آپؐ کا کیا ہوا (نیز آپ کی اجازت سے کیا ہوا) عمل بعد میں حدیث کے عنوان سے معروف ہوا۔اقوال و افعال کے اس تمام مجموعے کا ہم احادیث کے نام سے حوالہ دیں گے اور ان میں الگ الگ قول یا روایت کو حدیث کہیں گے۔آنحضرتؐ کے اقوال جو احادیث میں نقل ہوئے اور آیاتِ قرآنی، دونوں ہی ابتداء میں آپؐ کی زبان پر جاری ہوئے تھے۔تاہم آپؐ ہی نے ہمیشہ کلامِ خداوندی اور گفتۂ رسول کے درمیان احتیاط سے امتیاز قائم رکھا۔ آج تک تمام مسلمان اس فرق کو ملحوظ رکھے ہوئے ہیں کہ اس فرقِ مراتب کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ بھی کہیے کم ہوگا۔

کلامِ خداوندی ازلی اور غیر مخلوق ہے جبکہ رسولِ خداؐ کا کہا ہوا اگر چہ بلا شبہ خدا کا الہام کردہ ہے مگر اسے فرمانِ ایزدی سے بہر صورت الگ رکھنا چاہیے۔قرآن کی برتری اور مرکزی حیثیت مسلم ہے۔مسلمان جب قرآن کے بارے میں بات کرتے ہیں یا لکھتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالی نے فرمایا'' لیکن جب اشارہ حدیث کی طرف ہو تو یوں کہا جاتا ہے کہ ''اللہ کے رسولؐ نے فرمایا''۔احادیث کی

ایک خاص قسم وہ ہے جس میں آنحضرتؐ نے اللہ تعالیٰ کا فرمان بیان کیا ہے۔ ان سے پہلے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ''حضور نے فرمایا کہ اللہ کا فرمان یہ ہے......'' اس زمرۂ احادیث کو اکثر حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے۔ یہ احادیث قرآن سے کاملاً الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ یہ اللہ کا کلامِ ازلی نہیں بلکہ رسولِ خداؐ کے الفاظ ہیں۔ تاہم ان احادیت کو ایک خاص تعظیم دی جاتی ہے جیسا کہ 'حدیثِ قدسی' کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو اللہ کے اس کلام کا علم الہامی طور پر حاصل تھا۔9

مدینہ میں اسلام ایک طرزِ زیست تھا جس میں انسانوں کی دنیا کا کوئی گوشہ احکامِ الٰہیہ سے باہر نہیں تھا۔ بعض معاملات کو اگرچہ مباحات میں شمار کیا جاتا تھا اور ان پر امر و نہی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا تاہم اس کا فیصلہ بھی اللہ اور اس کے رسول کے وسیلے سے ہوتا تھا۔ بعد کے زمانوں میں یہ خیال کبھی مسلمانوں کے شعور سے جدا نہیں ہوا کہ زندگی کی ہر چیز کو دین کی بتائی ہوئی ہدایات کے تحت ہونا چاہیے۔ اکثر ادوار ایسے تھے جن میں حکومتیں اپنی دنیاوی اغراض کی غلام بنی رہتی تھیں۔ مسلمان اسے دنیا کی قباحتوں میں سے ایک کے طور قبول تو کر لیتے تھے اس پر راضی کبھی نہیں ہوئے۔ ہمارے زمانے میں اسلامی ممالک کی بہت سی سیاسی تحریکوں نے زمانوں پر پھیلے ہوئے اسی احساس کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی کہ حکومت کو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق چلانا چاہیے۔ اسلامی حکومتوں کے کرتا دھرتا حضرات اسلامی اقدار کو سچ مچ نافذ کرنا چاہتے ہیں یا نہیں اور وہ اس کے نفاذ میں کامیاب ہوئے یا نہیں، یہ ایک جداگانہ معاملہ ہے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اسلام کو داخلی کشاکش اور نشوونما کے کتنے ہی

مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ان میں سے سب سے نمایاں وہ اختلاف تھا جو آپؐ کی خلافت کے معاملے میں مسلمانوں کی اکثریت کو چند لوگوں کی طرف سے پیش آیا۔ جمعیتِ اسلام اس مسئلے پر دولخت ہوئی ۔ایک گروہ سنی اور دوسرا شیعی کہلایا۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت حضرت علیؓ اور ان کی اہلیہ دخترِ رسول سیدہ فاطمہؓ سے تعلق رکھنے والا ایک گروہ اس بات کا مدعی ہوا کہ آپؐ نے اپنی وفات کے بعد حضرت علی کو امت کا امام بنانے کے لیے چن رکھا تھا۔مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہ تھی سو ان کے سب بڑے یکجا ہوئے اور انہوں نے مل کر حضرت ابوبکرؓ کو جانشینِ رسولؐ چن لیا۔ان کا کی ذمہ داری یہ ٹھہری کہ وہ مسلمانوں کے امیر ہوں گے اور خدا کے قانون کے مطابق ان کے معاملات کا فیصلہ کیا کریں گے۔حضرت علیؓ کے گرد جو حامیوں کا ایک گروہ تھا اس کی طرف سے شروع میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو جائز تسلیم کرنے میں پس و پیش کیا گیا مگر آخر کار جب حضرت علیؓ نے خود حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی تو شیعانِ علی نے بھی ان کی پیروی میں اسے قبول کر لیا۔تاہم حضرت علیؓ نے اپنا یہ مطالبہ ترک نہیں کیا۔شیعہ حضرات کے نقطۂ نظر کے مطابق خلافت کی صحیح ترتیب اس روز قائم ہوئی جب امتِ مسلمہ نے حضرت علیؓ کو سن ۳۵ھ/۶۵۶ء میں آنحضورؐ کا چوتھا خلیفہ منتخب کیا۔لیکن پانچ سال بعد سن ۴۰ھ/۶۶۱ء میں حضرت علیؓ کو سیاسی مخالفین نے شہید کر دیا اور اس کے بعد بڑی بڑی موروثی خلافتوں کا زمانہ شروع ہوا، پہلے بنو امیہ کی خلافت اور بعد ازاں خلافتِ عباسیہ۔حضرت علیؓ کو شیعہ حضرات امت کا پہلا جائز امام قرار دیتے ہیں جبکہ سنی حضرات ان کو چوتھا خلیفۂ راشد سمجھتے ہیں۔ان کے بعد اسلامی دنیا پر جو سلطنتیں حکمرانی کرتی رہیں ان میں سیاست غلبہ حاصل کرتی گئی۔ اسلام کی

تعلیمات حکمرانِ وقت کو سندِ جواز عطا کرنے کی حد تک تو ضرور کارفرما تھیں مگر حکومت کے طور طریقوں کی اسلام کے مطلوبہ آدرش سے مطابقت رکھنا ایک لازمی امر نہ رہا۔

آنحضرتؐ کی وفات کے سو برس کے اندر اندر مسلمان مہذب دنیا کے بڑے حصے کے حکمران بن گیے۔ یہ علاقہ جنوبی سپین سے لے کر ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ سیاسی تسلط کے معنی یہ نہیں تھے کہ تمام محکوم اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں، ہرگز نہیں۔ قرآن کے بیان کردہ اُصول "لا اکراہ فی الدین" (۲:۲۵۶) (دین کے معاملے میں زبردستی نہیں) کا مطلب ہی یہ تھا کہ مقامی آبادی کو کسی طرح بھی دباؤ کے تحت زبردستی نیا دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جزیرہ نمائے عرب سے باہر اکثر لوگ یہودی، نصرانی یا زرتشتی تھے۔ انہیں اہلِ کتاب کی حیثیت حاصل تھی یعنی ان پر بھی وحی کے ذریعے آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں اور انہیں اپنے مذہبی معاملات اور مذہبی اداروں کو قائم رکھنے کی آزادی حاصل تھی۔ مسلم حکمران طبقے نے اپنی رعایا کے لوگوں کے قبولِ اسلام کی حوصلہ افزائی بھی کچھ خاص نہیں کی کہ اس طرح ان کی وہ مراعات کم ہو جاتیں جو بحیثیت مسلمان ان کو حاصل تھیں۔

تین چار صدیوں میں اسلام سب سے غالب سیاسی قوت بن چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ سپین اور شمالی افریقہ سے لے کر برصغیر ہندوستان تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کا سب سے مقبول اور غالب دین بھی اسلام تھا۔ تاہم یہ ایک الگ داستان ہے۔ اسے پڑھنا ہو تو تاریخِ اسلام پر لکھی جانے والی بہت سی کتب میں کوئی بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے۔

حدیثِ جبرئیل

وہ عقائد، اعمال اور مذہبی ادارے جن کی وجہ سے اسلام بڑے ادیان میں شمار ہوتا ہے ان کی اگر شرح و وضاحت کرنا مطلوب ہو تو اس کے لیے ایسا نمونہ منتخب کرنا چاہیے جو جدید علمی دنیا کے لیے بھی قابلِ فہم ہو اور دوسری طرف اس کی جڑیں اسلام کے روایتی علوم میں پیوست ہوں۔ بہت سال پہلے جب ہم نے اسلام پر تعارفی کورس پڑھانا شروع کیا تو اس غرض سے ایک مشہور اور مستند حدیث کا انتخاب کیا جو مسلمان مفکرین کی کلاسیکی تصانیف میں انہی مباحث کی توضیح کے لیے بکثرت استعمال ہوئی ہے۔[11] عام طور پر ہم اپنے طالبعلموں کو یہ حدیث یاد کروا دیتے تھے۔ روایتی اسلامی طرزِ تدریس میں بھی یونہی کیا جاتا تھا۔ اگر انہیں حدیث کی عبارت زبانی یاد نہ ہو سکے تو بھی کورس کے اختتام تک ان کے لیے اس حدیث کو فراموش کرنا آسان نہ رہتا تھا کہ اس ایک حدیث میں وہ سب کچھ ایک ایجاز کے ساتھ بند تھا جو انہوں نے سمسٹر کے دوران پڑھا تھا۔ یہی نہیں اس حدیث میں ان تمام مباحث کا خاکہ بھی موجود ہے جو ہماری اس کتاب میں شامل ہیں۔

حدیث کا متن درج ذیل ہے:

حدیثِ جبرئیل

حَدَّثَنِی أَبِی عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ: بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ، شَدِیدُ سَوَادِ الشَّعَرِ، لَا یُرَی عَلَیْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا یَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰی جَلَسَ إِلَی النَّبِیِّ ﷺ

فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَىٰ رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَىٰ فَخِذَيْهِ، وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَن لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا)) قَالَ صَدَقْتَ۔ قَالَ ۔ : فَعَجِبْنَا لَهُ، يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ؟ قَالَ : ((أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ)) قَالَ صَدَقْتَ۔ قَالَ ۔: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ؟ قَالَ: ((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهُ يَرَاكَ)) قَالَ : فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ؟ قَالَ: ((مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا؟ قَالَ: ((أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ، الْعَالَةَ، رِعَاءَ الشَّاءِ، يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ)) قَالَ ثُمَّ انطَلَقَ، فَلَبِثْتُ مَلِيًّا، ثُمَّ قَالَ لِي: ((يَا عُمَرُ! أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ؟)) قُلْتُ: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ: ((فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ، أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ)) ۱۲ ؎

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے سے نمودار

ہوا۔اس کا لباس نہایت سفید تھا اور بال انتہائی سیاہ۔اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا،اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔(وہ چلتا ہوا آیا) یہاں تک کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اوراپنے ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو پر رکھ دیئے اور کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیں۔''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکواۃ ادا کرو،رمضان کے روزے رکھواور اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو۔''

وہ بولا: ''آپؐ نے سچ کہا۔'' ہمیں یہ بات عجیب لگی کہ یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتا ہے اور پھر تصدیق بھی کرتا ہے کہ آپؐ نے سچ کہا! (اس کے بعد) اس نے کہا: ''اب مجھے بتایئے کہ ایمان کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخر پر ......اور یہ کہ تم یقین رکھو تقدیر پر اور اس کے خیر وشر پر۔'' ''سچ کہا آپ نے'' اس نے کہا اور پھر استفسار کیا: ''اب مجھے بتایئے کہ احسان کیا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔''

پھر اس شخص نے پوچھا: ''مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔''

اس نے کہا: ''مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجیے!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کنیز اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا ہے نہ تن پر کپڑا، بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کے دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص رخصت ہو گیا۔ میں خاصی دیر تک منتظر رہا، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''اے عمر! تمہیں معلوم ہے کہ وہ سوال کرنے والا کون تھا؟'' میں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جبرئیل تھے۔ تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔''

حدیثِ جبرئیل کے معانی کی وضاحت تو ہم اس کتاب کے آخر تک کرتے رہیں گے۔ سرِ دست اس کے ضمن میں کچھ معلومات نذرِ قارئین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس حدیث کے اصل مخاطبین کے لیے جو باتیں سامنے کی چیز تھیں وہ صدیوں اور میلوں کی مسافت پر واقع آج کے قاری کے لیے مبہم بن گئیں ہیں۔

ذرا صورتحال کا تصور کرنے کی کوشش کیجیے۔ روئے ارض پر اس وقت رسولِ خداؐ سے بڑی انسانی ہستی اور کوئی موجود نہیں تھی۔ یہ صرف صحابہ ہی کا خیال نہیں تھا۔ تاریخ نے اس امر کی شہادت دی ہے۔ آپؐ اپنے صحابہ کے جلو میں نخلستان مدینہ کے کنارے تشریف فرما ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آپؐ کا کہا اللہ کا فرمان ہے۔ ایسے میں اچانک ایک شخص نمودار ہوتا ہے جو سب کے لیے اجنبی ہے۔

مدینہ اس زمانے میں تھوڑی سی آبادی کا ایک قصبہ تھا اور صحرا کے وسط میں

واقع تھا۔آبادی چند سو یا چند ہزار نفوس پر مشتمل رہی ہوگی۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے شناسائی رکھتا تھا۔آبادی مختصر ہو اور سفر دشوار تو پھر مسافر کی آمد ایک واقعہ ہوتی ہے۔چند گھنٹوں میں ہر شخص کو نو وارد کی خبر ہو جاتی ہے۔ذاتی تعلقات کا تانا بانا جو خاندانوں،قبیلوں اور دیگر رشتوں پر استوار تھا اس بات کو یقینی بنا دیتا تھا کہ ہر خبر فی الفور سب لوگوں میں پھیل جائے گی۔آج کی دنیا میں شاید ٹی وی پر شام کی خبریں بھی اتنی خوبی سے یہ کام انجام نہیں دے سکتیں۔اب دیکھیے کہ ایسے میں ایک شخص اچانک ظاہر ہوتا ہے۔اسے کوئی نہیں جانتا۔شہر میں کئی روز سے کسی مسافر کی آمد نہیں ہوئی۔فلاں صاحب کے چچا البتہ آئے تھے اور حاضرین میں بہت سے لوگ ان سے مل چکے ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ صحابہ اس نو وارد کو پہچاننے سے قاصر رہے،آنے والے پر کہیں سے سفر کے بھی کوئی آثار نہیں تھے اور یہ مزید اچنبھے کی بات ہے۔اگر وہ شخص سب کے لیے اجنبی تھا تو پھر امکان یہی تھا کہ وہ تازہ واردانِ شہر میں سے ہوگا اور صحرا میں دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد کوئی بھی اتنی جلدی تازہ دم ہو کر نہیں آ سکتا خواہ اس نے اونٹ پر اپنا سفر راتوں کو چل کر طے کیا ہو۔(آپ کو چھ گھنٹے موٹر کار میں بیٹھنا پڑے تو اکتا کر شکایت کرنے لگتے ہیں۔ذرا سوچیے کہ گرد و گرما میں جھلتے ہوئے چھ دن کا سفر کیسا ہوتا ہوگا جہاں اثنا ءسفر میں کافی یا سوڈا پینے کے لیے کوئی مسافر نواز خنک ریستوران راہ میں نہ پڑتا ہو)

ادھر وہ شخص مجلس میں داخل ہوا ادھر سب لوگ سراپا توجہ بن گئے۔یہ شخص کون ہو سکتا ہے؟ ہمیں اس کی آمد کا کیونکر علم نہ ہوا؟ دوسری عجیب بات: یہ شخص رسولِ خدا ؐ سے بے تکلف بھی تھا۔مجلس میں آ کر وہ سیدھا آپ ؐ کے سامنے گیا اور دو زانو ہو کر

مقابل بیٹھ گیا۔اس کے گھٹنے آپؐ کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔یاد رہے کہ آنحضرتؐ بھی دوزانو بیٹھے تھے،آج کے جدید مغربی لوگوں کی طرح عبادت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ مشرق کے باسیوں کے لیے بیٹھنے کا یہی قرینہ سادہ ترین اور آداب کے مطابق جانا جاتا ہے۔یہ بھی یاد رہے کہ گھروں میں بھی کرسیوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔لوگ باگ فرش پر نشست رکھتے تھے اور آج بھی دنیا کے بیشتر علاقوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ان علاقوں میں دنیا کے امیر ترین اور مہذب ترین خطے مثلاً جاپان شامل ہیں۔دنیائے قدیم کے بیشتر علاقوں میں کرسی پر بیٹھنا حکمرانوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔

آپ کسی دوسرے شخص کے پاس جا کر اس کے گھٹنے سے گھٹنا بھڑا کر تبھی بیٹھ سکتے ہیں کہ وہ آپ کا بھائی یا بہت قریبی دوست ہو۔اگر ایسا نہ ہو اور صاحبِ مجلس کوئی دوسرا ہو تو قاعدے کی بات یہی ہوگی کہ اسے ادب سے سلام کیا جائے اور مناسب فاصلے پر بیٹھا جائے۔مگر وہ اجنبی مردِ صحرا تو آنحضرتؐ سے یقیناً گہری شناسائی رکھتا تھا۔جبھی تو اس نے آپؐ کے سامنے بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ آپؐ کے زانو پر رکھ دیئے۔اگر مہمان اجنبی ہوتا تو یہ حرکت بڑی جسارت کی بات سمجھی جاتی۔یہی نہیں،آنے والا شخص آپؐ کو نام لے کر مخاطب کر رہا تھا جبکہ مدینے کے لوگ آپؐ کو آپؐ کے لقب یعنی ''رسول اللہ'' کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔گفتگو بھی اس ہستی نے کسی تمہید کے بغیر اس طرح شروع کر دی گویا وہ اہلِ مجلس کی گفت وشنید میں پہلے سے شامل رہے ہوں۔

آنحضرتؐ نے ان کے پہلے سوال کا جواب دیا تو وہ صاحب بول اٹھے ''آپؐ نے درست کہا''۔حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ''ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ شخص خود ہی سوال بھی کرتا ہے اور پھر خود ہی جواب کی تصدیق بھی کر رہا ہے''۔حضرت عمرؓ کا یہ قول

اس وقت کی کیفیت کو بہر حال پوری طرح بیان نہیں کر رہا۔ امکان اس بات کا ہے کہ صحابہ دنگ رہ گئے ہوں۔ آخر یہ کیا بے تمیزی ہے؟ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کے سامنے آ کر سوالات اٹھانا اور پھر اسے داد دینا گویا خدا کا نبی نہ ہوا طفلِ مکتب ہوا! یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ لیکن اس مرحلے پر صحابہ کو آپ ؐ کو دیکھ کر معاملے کو سمجھنا تھا۔ آپ ؐ اس سے اس طرح گفتگو فرما رہے تھے گویا یہ سب کچھ بالکل روزمرّہ اور معمول کی بات ہو۔ اصحاب رسول آپ ؐ کی روش کا اتباع کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

وہ صاحب مجلس سے رخصت ہو چکے تو آپ ؐ نے چندے توقف فرمایا کہ آپ ؐ کے صحابہ اس عجیب وغریب واقعہ پر کچھ غور کر سکیں۔ پھر آپ ؐ نے ان سے بیان کیا کہ ان کے سامنے کیا پیش آیا تھا۔ اسے وہ آسانی سے بھول نہ سکتے تھے اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رات ڈھلے تک سارا شہرِ مدینہ حضرت جبرئیل کی آمد کا واقعہ جان چکا ہوگا۔ اس مہمانِ عزیز کو بھول بھی کون سکتا تھا کہ آنحضرت ؐ نے لوگوں کے سامنے ان کے دین کو خلاصہ کر کے پیش کر دیا تھا۔ انہیں جب بھی اساسیاتِ دین کا علم حاصل کرنا ہوگا وہ صرف یہ کریں گے کہ اس روز کے انوکھے واقعات کو یاد کر لیں۔

دین

حدیثِ جبرئیل سے ہمارے سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی ہے جس سے ہم جان سکتے ہیں کہ سیدنا محمد ؐ کے پیروکار جس دین پر عمل کرتے ہیں وہ کیا ہے۔ پہلے تین سوالات اور ان کا جواب ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں مذہب کے تین مرکزی عناصر ہیں۔ ہم ان عناصر کی طرف مذہب کی تین جہات کہہ کر اشارہ کریں گے۔ چوتھا سوال ایک اور مبحث کو جنم دیتا ہے۔ اس پر نظر کرنا بھی ضروری ہے سو ہم

اس کے بارے میں بھی کچھ عرض کریں گے۔تاہم اس سے قبل ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو ایک سہ جہاتی حقیقت کے طور پر وضاحت سے آپ کے سامنے لے آئیں۔چوتھے سوال سے پیدا ہونے والے مبحث کو ہم سر دست الگ رکھے دیتے ہیں۔

اسلام کی جہتِ اوّل تسلیم واطاعت ہے جو ایک سلسلۂ اعمال میں ظاہر ہوتی ہے پر مشتمل ہے۔عمل کے اس سلسلے میں کلمۂ شہادت ادا کرنا، نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا سب شامل ہیں۔تسلیم واطاعت کے لیے بھی عربی کا وہی لفظ ''اسلام'' استعمال ہوتا ہے جو اس دین کے عنوان کے طور پر برتا گیا ہے۔آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ''اسلام'' کے لفظ کے اور بھی معنی ہیں۔موجودہ سیاق وسباق میں ''اسلام'' کا لفظ ان کاموں کے لیے استعمال ہوا ہے جو ایک مسلمان کو لازماً انجام دینا چاہیے۔

دوسری جہت ''ایمان'' ہے۔رسولِ خدا آپنے سامعین کو یہ نہیں بتا رہے ہیں کہ خود ایمان کیا ہے۔اس کی وجہ بلا شبہ یہی ہوگی کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کے مخاطب یہ جانتے ہیں کہ ایمان کیا ہے۔انہیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ ارکانِ ایمان کیا ہوں گے۔انہیں کن چیزوں پر ایمان رکھنا چاہیے۔جواب ہے اللہ پر ایمان، فرشتوں، کتابوں، صحیفوں، انبیاء ورسولوں پر ایمان اور دیگر باتیں۔

تیسری جہت کا تعلق خوبیٔ عمل یا احسان سے ہے یعنی عمل کو حسین بنانا یا عمل میں زیبائی پیدا کرنا۔یہاں آنحضرتؐ کے مدِ نظر عمل نہیں ہے بلکہ محرکِ عمل یا عمل کرنے کی نیت۔حسنِ عمل تبھی ممکن ہے کہ عمل خدا آگاہی سے انجام دیا جائے۔اللہ ہی حسن، خیر، زیبائی اور درست وصواب کا حتمی معیار ہے۔

آنحضورؐ نے سوالات کے جواب میں جو ارشاد فرمایا اس کے بارے میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ آخر تمام فرشتوں میں سے جبرئیل ہی کیوں اس موقع پر ظاہر ہوئے؟ اس سے قبل ہم ایک نکتے پر غور کرنے کی آپ کو دعوت دیں گے جو اس حدیث میں استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ پہ خصوصی توجہ دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس لفظ کے وسیلے ہی سے ان عناصرِ سہ گانہ کو ایک کلیت اور مشترکہ عنوان دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے چاروں سوالات کا جواب ارشاد کرنے کے بعد چاروں جوابات کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا کہ یہ ''تمہارا دین ہے''۔ آپؐ نے عربی کا لفظ ''دین'' استعمال فرمایا ہے۔[۱۳] ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس محل استعمال میں ''دین'' کا لفظ آنحضرت اور آپؐ کے سننے والوں کے لیے کیا معنویت رکھتا تھا۔

آنحضرتؐ جس عربی زبان میں کلام کرتے تھے اس کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس اولین اور بنیادی مأخذ خود قرآن ہے اور اس کے بعد علماء کی لکھی ہوئی قرآنی تفاسیر۔ آپؐ جب بھی کوئی ایسا لفظ بولتے جو قرآن میں موجود ہوتا تو آپؐ کے سامنے اس کے قرآنی معانی ہوتے تھے۔ لفظ ''دین'' کے لیے بھی ہم پہلے لغت میں اس کی تعریف دیکھیں گے اور پھر قرآن میں اس کے معانی پر نظر کریں گے۔

لفظ ''دین'' کا بنیادی اور اصل مفہوم ہے حکم ماننا، اطاعت کرنا، بندگی کرنا۔ اسی کے قریب ایک اور لفظ ہے جو عربی میں دین ہی کی طرح لکھا جاتا ہے یعنی ''دَین''۔ اس کا مطلب ہے ''قرض''۔ فرمانبرداری اور قرض کے مابین جو تعلق ہے اسے سمجھنا کچھ خاص دشوار نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو کچھ رقم ادھار دیں اور وہ شخص آپ کا دین دار ہو تو اس کا فرض ہے کہ آپ کو رقم واپس کرے۔ یاد رہے کہ ہمارا

واسطہ ایک ایسے معاشرے سے ہے جہاں انسانی تعلقات ہی سبھی کچھ تھے اور یہ معاملہ کسی غیر شخصی چیز مثلاً بینک سے قرضہ لینے سے مختلف بات ہے۔ یہاں قرضہ دینے والا آپ ہی کے معاشرے کا ایک فرد ہے اور ہر شخص کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ اب آپ اس کے مقروض ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس طرح کی معاشرت میں آدمی کی بات ہی اس کا اعتبار ہوتی ہے۔ قول کا اعتبار اٹھ جائے تو پھر انسان کی عزت اور ساکھ بھی نہیں رہتی اور عزت جاتی رہے تو انسان گویا انسان سے کچھ فروتر ہو جاتا ہے۔ ان ذاتی، شخصی تعلقات کا پاس ولحاظ، اپنی آبرو اور خاندان قبیلے کی عزت کا خیال آپ کو مجبور کر دیتا ہے کہ اگر آپ کسی کے زیر بار ہیں تو اس شخص کی تعظیم کریں، اس کی بات کو وقعت دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی کے مرہونِ احسان ہوں تو کسی حد تک اس کی خواہش کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف دیکھیے تو کسی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا بھی گویا اس بات کا اعلان ہے کہ آپ کسی طرح اس کے احسان مند ہیں۔

عربی کی لغات اُٹھا کر دیکھیے تو عربی کے لفظ ''دین'' کے بہت سے مترادف الفاظ مل جائیں گے۔ ان سے آپ کو اس لفظ کے دائرۂ معانی کی وسعت کا اندازہ ہوگا: اطاعت؛ فرمانبرداری؛ تذلّل؛ خوئے تسلیم؛ مذہب یعنی خدا کی بندگی کا وسیلہ؛ وحدتِ خداوندی کا عقیدہ؛ دینِ اسلام؛ کوئی مخصوص قانون، قاعدہ ضابطہ یا حکم؛ رسوم و رواج و شعائر اور تہواروں وغیرہ کا نظام جو پچھلے لوگوں سے چلا آتا ہو؛ عرف و عادت؛ راستہ، طریقہ، راہِ عمل؛ تدبیرِ امور۔ ''دین'' کے لفظ کے کچھ معانی وہ بھی ہیں جو اسے ''دَین'' کے لفظ سے قریب لے آتے ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ ''ادائی، عوضی رقم، بدلہ، معاوضہ، جزا یا صلہ، تلافی مافات، مکافات، ہرجانہ نیز پاداش یا کفارہ

اورحساب کتاب اور یوم الحساب اور عالم اخروی میں حتمی فیصلہ وجزا وسزا'' کے معانی پر بھی دلالت کرتا ہے۔

دین کے لفظ میں معانی کی کچھ مزید تہ داری بھی موجود ہے مگر اب تک ہم نے جن مفاہیم کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اسے کسی ایک لفظ کے کوزے میں بند کرنے سے کیسے کیسے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔[۱۵] جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ''وہ تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے'' تو اس سے آپ کی مراد اصل میں کیا تھی؟ ہماری درج کردہ تعریفات اس ضمن میں معاون ہو سکتی ہیں۔ آپ کی مراد اولاً تو یہی تھی کہ ''تمہارا دین'' ''اسلام'' ہے یعنی قرآن کے بیان کردہ راستے کا نام اور عنوان۔ آپ کو یقیناً دین اور دین کے درمیان معنوی ربط کا بھی دھیان ہوگا کہ دین کے لفظ کو چن کر استعمال کرنے میں ایک قرینہ یہ بھی ملحوظ رہا ہوگا۔ دونوں الفاظ کا یہ ربطِ باہم ہی اس بیان میں ایک اخلاقی وزن پیدا کر رہا تھا جو آپؐ اپنے اصحاب کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مسلمان اسلام کو وہ ذمہ داری اور وہ قرض گردانتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ان پر عائد ہوئی ہے اور قرض وہ شے ہے کہ جس کی ادائی کے وہ اخلاقی طور پر مکلّف ہیں۔ وہ اللہ کے مرہونِ منت ہیں اس لیے کہ اس نے پہلے ان کو وجود عطا کیا اور پھر ان کی فلاح ابدی فلاحِ کا سامان فراہم کر دیا۔ جب اسلام کو ''دین'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس میں ایک ''لازم یا ضروری ہونے'' کا احساس بڑی شدت سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی تو سب سے بڑی اخلاقی ذمہ داری ہے بلکہ انسان کے کرنے کا کام اور وصفِ انسانیت کا تقاضا ہی یہی ہے۔ جو شخص کسی کے قرض سے زیر بار ہو اور پھر حسبِ وعدہ ادا نہ کرے وہ اپنا عزت و وقار کھو بیٹھتا ہے اور انسان کہلانے کے لائق

نہیں رہتا، اسی طرح وہ آدمی جو دین سے پہلو تہی کرے وہ بھی انسان کے رتبے سے گر جاتا ہے، قابل نفرین بھی نہیں رہتا۔ حدیثِ جبرئیل اگر ایک طرف ''تمہارے دین'' کا بیان کر رہی ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی بتا رہی ہے کہ وہ کونسا قرض ہے جو اللہ کی طرف سے ہمارے ذمے ہے۔ اللہ ہی تو حقیقت ہے۔ ہم عنقریب یہ دکھائیں گے کہ ''دین'' کے لفظ کی لغت میں بیان کردہ کتنی ہی تعریفیں ایسی ہیں جو اس چیز سے عین مطابقت رکھتی ہیں جسے مسلمان اسلام کہتے ہیں۔ پہلے ذرا یہ دیکھیے کہ قرآن میں دین کا لفظ کیسے اور کن معانی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ قرآن نے یہ لفظ ۹۰ مقامات پر برتا ہے۔

وسیع ترین مفہوم میں لیجیے تو قرآن اس اصطلاح کو قوانین وضوابط کے ایک مجموعے یا عملِ صحیح کے مثالی معیارات کے مجموعے کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ جن مقامات پر لفظ اس عام اور وسیع معنی ومفہوم میں استعمال ہوا ہے وہاں ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ مذکورہ دین صحیح ہے یا غلط، حق ہے یا باطل تاوقتیکہ ہم لفظ کے سیاق و سباق پر غور نہ کریں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بن یامین کو مصر میں روکنے کے لیے ایک حیلہ کیا کیونکہ ''مَا كَانَ لِيَأْخُذَ اخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ'' (۱۲:۷۶) (اس بادشاہ کے قانون وانصاف سے تو وہ اپنے بھائی کو ہرگز نہ لے سکتے)۔ مترجمین عموماً اس آیت کے ترجمے میں ''دین'' کو ''قانون'' Law کے لفظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق جھلکتی ہے جو مقدس اور غیر مقدس یا دینی اور دنیاوی کے مابین جدید دنیا میں عام ہو چکی ہے۔ لیکن زمانۂ قدیم کے تصورات کے بارے میں عموماً اور مصر کے عہدِ عتیق کے تصورِ کائنات کے بارے میں بالخصوص ہمیں جو معلومات میسر ہیں ان کی روشنی میں یہ کہنا کسی طرح روا نہ ہوگا کہ بادشاہ کا

قانون اس کے دین سے باہر کوئی چیز تھا یا اس کا دین اس کے قانون سے کسی طرح مختلف اور الگ تھا۔

اس اصطلاح کے عمومی استعمال کی ایک اور مثال وہ ہے جہاں قرآن نے اس سے آلِ فرعون کے طور طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قرآن میں مذکور سب سے اہم فسادی اور شرّی انسان فرعون ہے۔ فرعون اپنے مشیروں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

وَقَالَ فِرعَونُ ذَرُونِی اَقتُل مُوسٰی وَلیَدعُ رَبَّه اِنّی اَخَافُ اَن یُّبَدِّلَ دِینَکُم اَو اَن یُّظهِرَ فِی الاَرضِ الفَسَادَ (٤٠:٢٦)

مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ پڑا پکارے اپنے رب کو۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ وہ یا تو تمہارا دین بگاڑ دے گا یا تمہارے ملک میں خرابی کی راہ نکالے گا۔

بہ الفاظِ دگر، اگر تم موسیٰ کے کہے پر کان دھرو گے تو اس دین کو چھوڑ بیٹھو گے جس کے ہم سب پیروکار ہیں اور پھر ہمارا سماجی تانا بانا درہم برہم ہو جائے گا۔ سماج کی یہ بُنت یہ سماجی ڈھانچہ کیا تھا! وہ قاعدے ضابطے جن کو سماجی استحکام اور توازن برقرار رکھنے کے لیے مانا جاتا تھا۔

آگے بڑھیے تو دین کا لفظ قدرے خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مفہوم میں ''دین'' ایک جامع عنوان ہے اس پیغامِ خداوندی کے لیے جو سیدنا محمدؐ سمیت تمام انبیاء لے کر آئے۔ چنانچہ قرآن سیدنا محمدؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو ان الفاظ

میں خطاب کرتا ہے۔آیت میں صیغۂ واحد (لک)اور صیغۂ جمع (لکم) کا فرق قابلِ توجہ ہے۔ہم نے اپنی تحریر میں ہر جگہ قرآن کے اسلوبِ بیان مثال بنا کر صیغۂ واحد حاضر اور جمع حاضر میں امتیاز کو باقی رکھا ہے کیونکہ اس سے اکثر مقامات پر آیت کے معانی کی ایک اہم پرت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جیسا کہ درجِ ذیل آیت میں آپ دیکھیں گے۔اللہ تعالیٰ کے لیے واحد غائب اور متکلم کے صیغوں کا ادل بدل کر استعمال بھی نظر میں رکھیے کیونکہ یہ بھی قرآنی ندرتِ کلام کا خاصہ ہے۔[16]

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَالَّذِي اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرَاهِيمَ وَ مُوسٰى وَ عِيسٰى اَنْ اَقِيمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۴۲:۱۳)

راہ ڈال دی تم کو دین میں، وہی جو کہ دیا تھا نوح کو، اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف، اور وہ جو کہ دیا ہم نے ابراہیم کو، اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین، اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔

یہ دین کیا ہے جس کو قائم کرنے کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے نوحؑ و ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور سیدنا محمد علیہ السلام پر عائد کیا؟ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ سب انبیاء ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' کی شہادت دیتے رہے اور اس الٰہِ واحد کی عبادت کرتے رہے جو اس کلمۂ شہادت کا موضوع ہے۔یہ شہادت و عبادت ''توحید'' کہلاتی ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں ''اللہ کے ایک ہونے کا اعلان''۔''توحید'' ہماری کتاب کا ایک بڑا موضوع ہے۔قرآنِ مجید صراحت سے یہ بات بیان کرتا ہے کہ اللہ کے سب پیغمبر ''توحید'' ہی کی دعوت لے کر آئے تھے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ (۲۱:۲۵)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا جسے یہ وحی نہ کی گئی ہو کہ بات یوں ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں سو میری بندگی کرو۔

حضرت یوسفؑ کی اسیری کا قصہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔آپ نے زنداں کے ساتھیوں کو جو نصیحت کی وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔یہاں انہوں نے دینِ صحیح کو ''توحید'' ہی کہا ہے:

اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ - ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۱۲:۴۰)

حکومت نہیں ہے کسی کی سوا اللہ کے، اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو۔ یہی ہے سیدھا، استوار دین، پر بہت لوگ نہیں جانتے۔

''اسلام'' کا لفظ بھی ''دین'' کی طرح بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔اس کی تفصیل ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔اپنے وسیع معنی میں یہ اس تسلیم پر دلالت کرتا ہے جو ہر نبی و رسول اللہ کے سامنے بجا لاتا ہے۔سیدنا ابراہیمؑ تو بالخصوص اس وصفِ تسلیم میں کامل جانے جاتے ہیں:

اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ ـ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ـ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَ يَعۡقُوۡبُ ـ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَـكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ

(۲:۱۳۲)

اس کو کہا اس کے رب نے، حکم بردار ہو۔ بولا میں حکم میں آیا جہان کے صاحب کے۔ اور یہی وصیت ابراہیمؑ اور یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو کر گئے۔ اے بیٹو! اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین، پھر نہ مرنا مگر مسلمانی پر۔

ان آیات میں اور قرآن میں دیگر مقامات پر ''الدین'' کے لفظ سے توحید اور بالکل عام اور وسیع ترین مفہوم میں خوئے تسلیم وسرافگندگی مراد لی گئی ہے۔ یہاں یہ لفظ اسلام اور ماقبلِ اسلام کے مذاہب سب کا احاطہ کرتا ہے۔ ان آیات میں جو بات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دین اللہ کا قائم کردہ ہے اور مقاصد الٰہیہ کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ اسی سے ان بہت سی قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہوتا ہے جو زور دے کر اعلان کرتی ہیں کہ دین لازماً اللہ ہی کے لیے ہے۔ بہ الفاظِ دگر کوئی بھی دین، مثلاً قرآن میں مذکور فرعون کا دین، جو اللہ کا دیا ہوا نہ ہو وہ سچا دین نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر لوگ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے کسی دین پر عمل کرتے ہوئے زندگی نہ گزاریں اور اپنی مرضی کرنے لگیں تو ایسا دین حقیقی دین نہیں رہتا۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعاً وَّ کَرْھًا وَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (۳:۸۳)

اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے، یا زور سے، اور اسی کی طرف پھر جائیں گے

وَقَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰھَیْنِ اثْنَیْنِ۔ اِنَّمَا ھُوَاِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ۔ وَلَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَہُ الدِّیْنُ وَاصِباً۔ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَتَّقُوْنَ (۱۶:۵۱-۵۲)

اور کہا اللہ نے ، نہ پکڑو معبود دو ۔وہ معبود ایک ہے۔سو مجھی سے ڈرو۔اور اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور اسی کا دین ہے ہمیشہ۔سو کیا اللہ کے سوا کسی سے خطرہ رکھتے ہو۔

فَاعْبُدِاللّٰہ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّین ۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الخَالِصُ

(۳۹:۲- ۳)

سو بندگی کرو اللہ کی، خالص کر کے اس کے واسطے بندگی۔سنتا ہے! اللہ ہی کو ہے بندگی نری۔

''دین'' کا لفظ اپنے خاص معنیٰ میں دین کی اس شکل سے عبارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمدؐ کے ذریعے نازل کی۔

اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ واَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الِاْسْلَامَ دِیْنًا (۵:۳)

آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا، اور پسند کیا میں نے تمہارے لیے دین مسلمانی۔

حدیثِ جبرئیل میں یہ لفظ اسی مفہوم میں برتا گیا ہے۔''دین'' بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ''الدین'' ان تعلیمات کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمدؐ اور ان کے پیروکاروں کے لیے مکمل کر دیا۔توحید و اطاعت الٰہی بھی ان تعلیمات میں شامل ہیں۔بالفاظِ دیگر ان کے دین پر خود اللہ کی طرف سے مہرِ تکمیل ثبت کی گئی ہے اور اللہ نے اسے اپنی پسند قرار دیا ہے۔

قرآن میں دین کے لفظ سے اسلام کے مخصوص اوامر و نواہی بھی مراد لیے گئے

ہیں۔مثال کے طور دیکھیے کہ آیت ذیل میں زنا کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے مقرر کردہ سزا کو ''خدا کا دین'' کہا گیا ہے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲:۲٤)

بدکاری کرنے والی عورت اور مرد، سو مارو ایک ایک کو دونوں میں سے، سو چوٹ تجھی، اور نہ آئے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں۔

اب تک کی تحریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ ''جبرئیل ...... تمھیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے'' تو آپؐ سب سے پہلے یہ واضح کر رہے تھے کہ خود اسلام کی نظر میں ''اسلام'' کیا ہے۔اسی کے ضمن میں آپؐ نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے عمومی طور پر دین کا کیا مفہوم ہے۔ہر مستند دین میں یقیناً یہ تینوں جہات موجود ہونا چاہیں جو آنحضرتؐ نے بیان کیں۔سو اگر چہ ہماری بحث کا مرکز یہ ہوگا کہ اسلام اپنے بارے میں کیا کہتا ہے تا ہم ہم اس بات کو بھی زیر بحث لائیں گے، کبھی صراحتاً اور کبھی کنایتاً، کہ ایک کائناتی حقیقت یعنی ''دین'' کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے کہ اسلام خود اس حقیقت کے مظاہر میں سے ایک ہے۔

اسلام کی تین جہات Three Dimensions of Islam

ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دین کی تین جہات ہوتی ہیں:

اسلام (submission) ایمان (faith) احسان (doing what is beautiful) ان تینوں اصطلاحات کا ترجمہ قدرے پیچیدہ معاملہ ہے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر تفصیل سے بحث کی جائے۔ پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ لفظ ''جہت'' dimension کے استعمال میں کیا استعارہ مضمر ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی تین جہتیں ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ جیومیٹری (اقلیدس) کی اصطلاح میں بات کرنے سے اسلام پر غور کرنے میں سہولت ہوگی۔ حقیقتِ مکانی جس سے ہمیں ہمہ وقت سابقہ رہتا ہے اس کی تین ابعاد یا تین جہتیں ہیں (چوتھی جہت کو سرِ دست نظر انداز کر دیجیے)۔ طبعی اشیاء کو یا مادی اشیاء کو یک رخی، دو رخی یا سہ رخی اصطلاحات میں دیکھا جا سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک رخ کا، ایک جہت کا مطالعہ دوسرے سے الگ کرکے کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ہم مادی اشیاء و اشکال کا جائزہ صرف خطوط کے حوالے سے بھی لے سکتے ہیں، سطح کے اعتبار سے بھی اور رقبے کے لحاظ سے بھی۔ اور یہ بھی کر سکتے ہیں کہ طول و عرض کے ساتھ عمق یا گہرائی کو بھی ملحوظ رکھیں۔

ہم اسلام کی تین جہات پر الگ الگ گفتگو کریں گے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی اشارہ کرتے جائیں گے کہ یہ طریق کار صرف انکشافِ حقیقت میں مددگار ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ اسلام اپنے بارے میں جو بیان کرتا ہے، اپنے آپ کو جس طرح پیش کرتا ہے وہ یک رخی چیز نہیں ہے بلکہ کئی عناصر سے

مرکب ہے لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے پوری تصویر کے تمام رخ ایک ایک کرکے سامنے لانا ہوں گے۔ان جہات کو جدا جدا کرکے بیان کرنے سے مقصود یہی ہے کہ قاری پر واضح ہو جائے کہ یہ جہات مل کر ایک کُل کی صورت گری کرتی ہیں۔یہ ایسا ہی ہے کہ اگر آپ لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے غرض یہ بتانا ہوتا ہے کہ مکان (space) کا ٹھیک سے تصور کرنے کے لیے ان تینوں پر نظر کرنا ضروری ہے۔

ان تین جہات کی ترتیب ہم نے وہی رکھی ہے جس میں یہ حدیثِ جبریئل کے اس متن میں وارد ہوئی ہیں جو ہم نے صفحاتِ ماقبل میں نقل کیا تھا۔اس کے علاوہ بھی ترتیب ممکن تھی۔[7] موجودہ ترتیب کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یہ ایک بہت مناسب ترتیب ہے کہ اس میں آغاز اس جہت سے کیا گیا ہے جو بالکل سامنے کی چیز ہے اور اس تک رسائی آسان ترین ہے۔ہاں یہ ہے کہ یہاں آ کر مکانی استعارہ کچھ زیادہ مدد و معاون نہیں رہ جاتا اور وجودِ انسانی کی تین جہات کے حوالے سے غور کرنا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

ہستیِ انسانی پر ہم تین بنیادی جہات یا اقالیم یا تین درجاتِ وجود کے حوالے سے غور کر سکتے ہیں۔ان میں خارج کی جہت کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے۔ انسان مختلف کام کرتا ہے۔اس عمل پر بحث ہو سکتی ہے اور عمل کرنے والے شخص کے حوالے سے اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں ہم صرف اس عمل پر بھی نظر کر سکتے ہیں مثلاً ایک آدمی کسی عالمی کرکٹ سیریز میں فیصلہ کن چوکا لگاتا ہے اور جیت ہو جاتی ہے؛ کسی کی لاٹری نکل آئی؛ کسی نے اپنی تنخواہ وصول کی۔یہاں جو چیز اہم ہے وہ ہے واقعہ یا عمل۔شخصیات یا محرکاتِ عمل کا جائزہ لینا اگر ضروری ہو تو بعد میں

لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم چاہیں تو انسان کی شخصیت کی داخلی جہات کو بھی زیر غور لا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں دو سوال بنیادی ہیں جو کسی بھی شخص کے بارے میں پوچھے جا سکتے ہیں۔ پہلے سوال کا بیشتر تعلق علم سے ہے اور دوسرے کا نیت اور ارادے سے۔ جب ہم کسی عمل پر غور کرتے ہیں تو ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس عمل کے پیچھے کیا سوچ ہے اور یہ کام کیا سمجھ کر کیا گیا ہے؟ آپ نے بارہا سنا ہوگا، خاص طور پر والدین کی زبان سے یہ پھٹکار اکثر سننے کو ملتی ہے کہ "ایسی بے وقوفی کی حرکت کیسے کر ڈالی تم نے!" ایک شخص نے ایک کام کیا اور صاف نظر آ رہا ہے کہ اس سے یہ حرکت سراسر بے خبری میں سرزد ہوئی ہے اور اسے صورتحال کا بالکل علم نہیں تھا۔ لیکن جونہی ہم یہ سوال پوچھتے ہیں کہ "کسی شخص کو اصل صورتحال کا علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟" تو ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ "اصل صورتحال" کو کس طرح متعین کیا جائے گا؟ اس کی تعریف اس شخص اور اس کے عمل کے حوالے سے کی جائے گی یا سماجی اور ثقافتی سیاق و سباق میں؟ حیاتیاتی مجبوریوں کے لحاظ سے یا اس لمحۂ تاریخ کے حوالے سے جس میں یہ عمل واقع ہوا۔ کائنات کے در و بست اور نفسِ انسانی کی ساخت کا بھی مذکور ہوگا یا نہیں؟ خدا، فرشتے، شیاطین کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ ان میں سے کس چیز کا علم ہمیں "اصل صورتحال" کو سمجھنے کے قابل بناتا ہے یا ان چیزوں کا اس سے کوئی جوڑ نہیں۔ مطلب یہ کہ انسانی تجربے کی یہ جہت ایسی ہے جو علم، فہم اور انداز نظر سے متعلق ہے۔ اسلام ان مباحث پر کلام کرتے ہوئے ایمان کی برتر سطح سے کلام کرتا ہے۔ اس کی وجوہات آگے چل کر واضح ہو جائیں گی۔

انسان کی داخلی جہت اور انسانی عمل کے بارے میں بالکل مختلف نوعیت کے

کچھ اور سوالات بھی اٹھائے جا سکتے ہیں: محرکِ عمل کیا تھا؟ عمل کس نیت سے کیا گیا تھا؟ کوئی متبادل چناؤ ممکن تھا یا نہیں؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس ضروری علم تو ہوتا ہے مگر کرتے وہ پھر وہی ہیں جو دوسروں کی نظر میں نا قابل قبول ہوتا ہے۔ یہی نہیں، بسا اوقات ایسی حرکتیں جو ناگوار ہوں، کی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ دوسروں پر گراں گزریں۔ نیت اور محرکِ عمل کا معاملہ عدالتوں میں بھی اکثر زیر بحث آتا ہے۔ اگر کسی نے عمداً ایک غلط حرکت کی تو اسے جرم قرار دیا جاتا ہے تاہم اگر ارتکابِ جرم کا ارادہ نہیں تھا تو پھر سارے معاملے کا تجزیہ زیادہ احتیاط سے کرنا لازم ٹھہرتا ہے۔

دین بھی ایک سیدھا اور صحیح راستہ ہے۔ حدیثِ جبرئیل یہی بتاتی ہے کہ اسلام کی رو سے دین، عمل کے صحیح طریقوں، سوچنے اور جاننے کے درست انداز اور عمل کے پیچھے صحیح نیت اور ارادہ کرنے کے قرینے، ہر تین عناصر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس حدیث میں رسول خدا نے عمل، فہم اور نیت کے صحیح اسالیب کو الگ الگ عنوان دیا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''اسلام'' دین کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق عمل سے ہے، ''ایمان'' وہ حصہ ہے جو فکر و فہم سے متعلق ہے اور ''احسان'' وہ جزو ہے جو حسنِ نیت سے مربوط ہے۔ دین کی یہ تین جہات باہم مل کر اپنے امتزاج سے ایک حقیقتِ واحدہ بنتی ہیں جسے ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔

انسانی شخصیت ایک جیتی جاگتی واقعاتی حقیقت ہے، اس میں عمل، علم و فہم اور نیتوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا ہم اپنی اغراض و مقاصد کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارا واسطہ تو ایک انسانی شخصیت سے ہوتا جس کے لیے ہو سکتا ہے کہ اس امتیاز میں کوئی معنی ہی نہ ہوں۔ لوگ باگ تو بس اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ہم دور کھڑے مبصرین

کے طور پر اپنے دیکھے اور اندیکھے کو مختلف انواع و اقسام میں خواہ کتنا ہی تقسیم کرتے رہیں۔

اسی طرح مسلمان اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ علمِ کلام کے ماہرین، فلسفی، مورخین، ماہرین نفسیات اور دوسرے اہلِ علم اسے خانوں میں بانٹ کر دیکھتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ زندگی کی کلیت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ تاہم چیزوں کو تقسیم کرکے دیکھنے کے اس عمل میں ہمیں وہ چیز میسر آ جاتی ہے جسے دوبارہ جوڑ کر اور اجزاء کو اپنی جگہ رکھ کر ہم بہتر اور مکمل طور پر معاملے کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی علوم

اسلام کے حوالے سے دین کی تعریف متعین کرتے ہوئے ہم نے اداروں کا ذکر نہیں کیا۔ اداروں سے ہماری مراد ہے ایک سلسلۂ پیشوائیت یا نظامِ کلیسا۔ آج کل بہت سے لوگ بس کلیسا کی سرگرمیوں ہی کو دین کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یا کلیسا کے عہدے داروں یا پادریوں کی مصروفیات کو دین قرار دیتے ہیں۔ اسلام میں نہ کلیسا ہے نہ پادری نہ پروہت۔

گرجوں کی جگہ اسلام میں مسجدیں ہوتی ہیں۔ مسجد وہ عبادت گاہ ہے جسے مقامی طور پر مسلمان قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے پیچھے صاحبانِ اختیار کا کوئی مرکز نہیں ہوتا کہ ہم ''کلیسا'' کی طرح ''مسجد'' کو بھی ایک نظام یا ادارہ کہنے کا سوچ سکیں۔

پادریوں کی جگہ اسلام میں علماء ہوتے ہیں۔ عیسائیت جیسے دین میں مذہبی پیشوا کو کچھ ایسے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں جو عوام الناس کے بس میں نہیں

ہوتے۔ اسلام میں کوئی مذہبی فریضہ ایسا نہیں ہے جو معاشرے کا کوئی بھی عاقل بالغ فرد انجام نہ دے سکتا ہو۔ بایں ہمہ کچھ مسلمانوں کو دینی امور میں خاص مہارت ہوتی ہے۔ آپ نے ملا، علماء، یا آیت اللہ کے الفاظ سن رکھے ہوں گے۔ اس قسم کے الفاظ کی فہرست سازی کے بغیر ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ افراد جو مذہبی معاملات میں کوئی خاص کردار ادا کرتے ہیں ان کے لیے معروف لفظ ہے ''عالِم'' (اس کی جمع ہے علماء)۔ اس لفظ کا مطلب ہے ''صاحبِ علم'' وہ لوگ جو اسلامی علوم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں انہیں مسلمانوں میں ایک خاص حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ انہی کے ہاتھوں علم کی حفاظت ہوتی ہے اور یہی لوگ اسے منتقل بھی کرتے ہیں اور اسی سے دین کی روایت کو بقا ملتی ہے۔ بنیادی طور پر ان کا منصب کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے جسے آج کی اصطلاح میں resource person کہا جاتا ہے۔ وہ اسلامی علوم کے ماہرین ہیں، یہ ان کا اختصاص ہے اور وہ اپنے علم کو اپنے لوگوں کی فلاح کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس لحاظ سے ان کو پادریوں یا کلیسائی عہدہ داروں کی بجائے رِبّیوں سے زیادہ مشابہ کہا جا سکتا ہے۔

طبقۂ علماء میں شامل ہونے کے لیے کسی فرمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی شخص علم حاصل کر کے اہلِ علم میں شمار ہو سکتا ہے پھر جیسے جیسے آپ اپنا علم لوگوں پر کھولتے ہیں آپ کو صاحبِ علم کے طور پر شناخت کر لیا جاتا ہے۔ آپ بھی عالم کہلانے لگتے ہیں۔ علماء میں عورتوں کی تعداد کم ہی رہی ہے تاہم مشہور اہلِ علم خواتین کی مثالیں اتنی کثرت سے ملتی ہیں کہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نظری طور پر عورتوں کے علم حاصل کرنے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ کچھ سماجی رکاوٹیں ضرور حائل

رہی ہیں لیکن ان کی بنا بھی دین کی بنیادی تعلیمات پر نہیں ہے۔

صاحبِ علم ہونا ایک اضافی معاملہ ہے۔قرآن کے الفاظ میں ''وَفَوقَ کُلِّ ذِی عِلْمٍ عَلِیم'' (۱۲:۷۶)(اور ہر خبر والے سے اوپر ہے ایک اور علم والا)۔ایک چھوٹے سے گاؤں کی مثال لیجیے۔گاؤں کا ایک شخص کسی بڑے شہر کے لیے عزمِ سفر کرتا ہے اور دو ایک سال بعد قرآن و حدیث کے بارے میں ابتدائی علم حاصل کر کے لوٹ آتا ہے۔دیہاتیوں کی نظر میں تو یہی شخص صاحبِ علم گردانا جائے گا۔ وہ بخوشی اسے اپنی نمازوں کا امام بنائیں گے اور زندگی گزارنے کے لیے قرآنی ہدایات معلوم کرنے کے لیے اس سے رجوع کریں گے۔

مسلمانوں کے علمی مراکز مثلاً قاہرہ، دمشق، بغداد، استانبول، نجف، دہلی وغیرہ میں علماء کے بہت سے طبقات پائے جاتے تھے۔ہر طبقے میں ایک طرح کی درجہ بندی پائی جاتی تھی۔اس درجہ بندی کا کوئی خاص ضابطہ نہیں تھا تاہم آپ آسانی سے یہ جان لیتے تھے کہ کون اچھا عالم ہے اور کس کا علم کچا ہے۔

علم کے عظیم مراکز کا انحصار مسلمانوں کے مذہبی اوقاف پر ہوتا تھا۔ان میں سے اکثر میں ہر شخص کو تحصیلِ علم کی اجازت تھی اور مسندِ تدریس بھی ہر کسی کے لیے کھلی تھی۔حصولِ علم کی حوصلہ شکنی کم از کم اسلام کی حد تک ناممکنات میں سے تھی کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ ''طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم'' [18] (طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے) طالب علم بننے کے لیے صرف اتنا ہی معلوم کرنا پڑتا تھا کہ درس کا کہاں اور کب اجراء ہوگا۔اس کے بعد آپ درس میں شامل ہو جاتے تھے۔اکثر اوقات حلقۂ درس کسی بڑی مسجد کے کسی مخصوص ستون کے پاس قائم ہوتا تھا۔حلقۂ درس میں شریک ہونے کے بعد آپ پر کوئی نظر نہیں رکھی جاتی تھی تا آنکہ آپ خود کو

نمایاں کرنے کی کوشش کریں۔ بحث میں شامل ہونے کی پوری آزادی تھی لیکن اگر آپ کو اپنے موضوع سے شناسائی نہ ہوتو آپ نشانۂ تضحیک بن جاتے تھے یا دوسرے طلباء آپ کو خاموش کروا دیتے۔ آج کی طرح سندیں جاری کرنے کا رواج نہ تھا۔ ہاں اگر آپ نے کسی استاد کے ساتھ چند ماہ وسال گزارے ہوتے اور اس کے زیرِ تدریس کتاب پر عبور حاصل کرلیا ہوتا تو آپ کو اس کی طرف سے ایک تحریری سند عطا کر دی جاتی تھی جس کے بعد آپ اس کتاب کا درس دینے کے مجاز ہو جاتے تھے۔ علماء کے بارے میں جب لوگ باگ پرکھ پرچول کرتے تو یہی سوال کیا جاتا کہ فلاں عالم کو کون کون سی اسناد اور اجازات حاصل ہیں اور کس کس کی طرف سے؟ سند و اجازات کا مأخذ بہت ہی اہم چیز گردانا جاتا تھا کیونکہ بعض اساتذہ اپنے شاگردوں کو آسانی سے سندِ تحصیل دے دیتے تھے جبکہ کچھ علماء اس معاملے میں سختی کرتے تھے۔

قصبوں اور دیہات کے اساتذہ اپنے بہت سے طالبعلوں کو شہر کے کسی بڑے مدرسے میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے لیاقت اور استعداد شرط تھی۔ معروف اساتذہ کی طرف سے تعارفی خط داخلے اور قیام وطعام کی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ پڑھانے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ جسے سفارش میسر نہ ہو وہ بھی محروم نہیں رہتا تھا۔ کوئی بھی راہ چلتا آدمی کسی بھی مدرسے میں جا کر مالی امداد طلب کرسکتا تھا۔ اساتذہ کو اچھے لائق طالبعلموں کی مدد کر کے خوشی ہوتی تھی اور اگر وہ اپنی قابلیت کا ثبوت دے دیتا تو اس کو ہر طرح کی مدد فراہم کی جاتی تھی۔

ہر شخص کو تحصیلِ علم کی آزادی تھی اور ہر شخص تدریس کے لیے آزاد تھا۔ اس کا یہ

مطلب نہیں کہ ہر کس و نا کس کو مدرسے سے وظیفہ مل جاتا تھا۔ مراد یہ کہ آپ کسی بھی مسجد میں جا کر کسی ستون کے برابر نشست سنبھال کر کتاب کھول لیتے اور سننے والوں کو بتا دیتے کہ آپ درس دینے کی نیت سے آئے ہیں۔ اچھے اساتذہ کے گرد جلد ہی طالبانِ علم کا ہجوم ہونے لگتا تھا اور زیادہ دن نہ گزرتے تھے کہ انہیں وظائف ملنے لگتے۔ سیاسی جوڑ توڑ کی بات الگ ہے۔ اچھا استاد ہونے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا اور مسندِ تدریس ہی پر علم کی آزمائش ہوتی تھی۔ علم کا کھوکھلا دعویٰ رکھنے والوں کی قلعی جلد ہی کھل جاتی تھی۔ پھر ان کے حلقۂ تدریس کی طرف کوئی بھی رخ نہیں کرتا تھا۔

ہماری اب تک کی گفتگو سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ شاید اسلامی علوم کی تدریس صرف مدارس اور مساجد تک محدود تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ درس و تدریس ایک ایسا غیر رسمی معاملہ تھا جو کسی بھی جگہ جاری رہ سکتا تھا۔ ڈگریاں دینے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے حصولِ علم کا مقصد اور محرک علم کا حصول ہی تھا۔ [19] علم حاصل کرنے کو ایک مذہبی کام سمجھا جاتا تھا اور معاشرے کے ہر فرد سے اس عمل میں بساط بھر شریک ہونے کی توقع کی جاتی تھی۔ رسمی اداروں کی عدم موجودگی میں دین کا علم حاصل کرنے کے ذرائع کسی نہ کسی شکل میں ہر کس و نا کس کو میسر تھے۔ جوناتھن برکلے نے قاہرہ میں عہدِ وسطیٰ میں علمی سرگرمیوں پر ایک دلآویز تحریر مرتب کی ہے جس میں درس و تدریس کے اس عمل پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے اختتامیے میں وہ رقم طراز ہے:

عہدِ وسطیٰ میں تعلیم اداروں کی ڈگریوں پر مبنی کسی نظام کے سانچے میں مقید نہیں تھی۔ علومِ مذہبی کی تدریس کے لیے قائم مدارس کی بہتات کے باوصف درس و تدریس

مخصوص اداروں تک محدود نہیں تھی۔ جہاں کسی عالم نے قیام کرلیا وہیں سلسلۂ تعلیم و تعلم کا آغاز ہوگیا اور اس میں وہ سب لوگ شریک ہوگئے جو اس کے مخاطب تھے۔ تعلیم کا یہی شخصی اور زبانی اسلوب تھا جس کے کارن کسی نہ کسی شکل میں تعلیم ہر شخص کی دسترس میں تھی۔[۲۰]

اسلامی علوم کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو اسلام کی تین جہات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پھر ان علوم کو متعدد ذیلی اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ اسلام کی دوسری جہت پر اس کا اطلاق قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ علماء کی اکثریت تو عملِ صحیح (اسلام کی پہلی جہت) کی سطح سے آگے نہیں بڑھ پاتی کہ یہ اپنی جگہ ایک نہایت مفصل اور تہ دار شعبۂ علم ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی تمام عمر اسی شعبے کے لیے وقف کر سکتے ہیں۔ مزید براں وہ علماء جو اسلام کی اس جہتِ اوّل میں خصوصی مہارت حاصل کرتے ہیں انہیں بالعموم دنیاوی معاملات میں کہیں زیادہ الجھنا پڑتا ہے کیونکہ انہیں یہ بتانا لازم ہوتا ہے کہ لوگوں کے لیے صحیح کام کیا ہے اور غلط کیا۔ روایتی اسلامی معاشرے میں یہ علماء ماہرینِ قانون اور قاضیوں کا منصب سنبھالتے ہیں۔ انہیں فقہا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج کی مغربی دنیا میں وکلاء اور ماہرینِ قانون بہت طاقتور اور بااثر دیکھے جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں فقہا کو بھی یہی حیثیت حاصل تھی اور وہ اکثر بادشاہوں کے قانونی مشیر کا منصب سنبھالتے تھے۔ اسلامی معاشرے میں فقہا کا کردار اتنا اہم تھا کہ اکثر مسلمانوں کے لیے ''علماء'' اور ''فقہا'' مترادف الفاظ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جبکہ ''علماء'' کی اصطلاح اپنے معانی میں اس سے کہیں وسیع ہے۔

تمام اسلامی علوم کی بنیاد قرآنِ مجید ہے۔ تفسیر یعنی قرآنِ مجید کی شرح و

ترجمانی ایک الگ اختصاصی شعبۂ علم ہے۔تفسیر میں عموماً ساری کتابِ خدا کی آیت بہ آیت شرح ووضاحت کی جاتی ہے تاہم اکثر ایسی تفاسیر بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو کسی عالم نے کسی خاص سورۃ یا کسی حصۂ قرآن کے بارے میں تصنیف کی ہوتی ہیں۔علماء نے اپنے اپنے رجحان کے مطابق سبھی طرح کی تفاسیر لکھی ہیں۔بعض تفاسیر میں صرف متنِ قرآن کے الفاظ کی شرح ووضاحت ملتی ہے۔یہ تفاسیر عربی یا دیگر اسلامی زبانوں مثلاً فارسی یا ترکی میں تفصیلِ متن سے عبارت ہیں۔دیگر تفاسیر وہ ہیں جن میں صرف ونحو، تاریخی پس منظر، فقہی مضمرات واحکام، کلامی مباحث و عقاید، اخلاقی تربیت، تمثیلی ومجازی معانی یا ان کے علاوہ دیگر موضوعات کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔تمام علماء اپنے دائرہ اختصاص میں رہتے ہوئے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور اپنے فہمِ قرآن کو بیان کرتے۔جس طرح انہوں نے قرآن کو سمجھا اسے بیان کر دیتے۔ایک بات پر سب کا اتفاق تھا کہ قرآن کے معانی کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔[۱]

ایک لحاظ سے اگر صحیفۂ اسلام کے معانی کی تلاش وتفحص کو تفسیر کا نام دیا گیا ہے تو دوسرے اعتبار سے سارے اسلامی علوم قرآن ہی کی تفسیر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھیے تو عمل کے بارے میں قرآنی تعلیمات کو منظم انداز میں پیش کرنے کی ایک مثال فقہ ہے۔سو فقہ کی ''اصل'' یا اوّلین ماٴخذ بھی قرآن ہی ٹھہرتا ہے۔قرآنی تعلیمات پر بنیاد رکھ کر اور اس میں حدیث اور دیگر ماٴخذ سے استفادہ کے ذریعے اضافہ کر کے فقہا نے اسلامی علوم کے ایک بڑے شعبے کی بنا رکھی۔یہی عمل علمِ عقائد اور اخلاقیات کے میدان میں بھی نظر آتا ہے۔بعض شعبہ ہائے علم مثلاً فلسفہ ایسے ہیں جن میں قرآن سے تعلق کچھ ایسا صریح نہیں ہے تاہم ان

کے ضمن میں بھی یہ بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ ان علوم کو بھی بنیادی طور پر قرآن ہی کے فیض سے تحریک ملی ہے۔

جدید مغربی دنیا میں صحیفۂ خداوندی کو تہذیب نفس، خدا آگاہی اور صحیح اندازِ زیست اپنانے کا وسیلہ جانا جاتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے دیکھیے تو قرآن ان سب عناصر کے علاوہ بہت کچھ اور بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

روایتی تعلیم کا اولین مقصد قرآن پڑھنا تھا اور اس کا آغاز بچپن ہی سے کروا دیا جاتا تھا۔ بچوں کے لیے قرآن کے معانی کے فہم کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی کہ بالغ افراد بلکہ بڑے بڑے علماء تک قرآن کی کلی معنویت کے چند تراشوں کے فہم سے سوا اور کیا اندوختہ رکھتے ہیں! تعلیم میں اہم بات یہ تھی کہ کلام اللہ کو ازبر کر لیا جائے۔ قرآن کے اصل الفاظ، گفتۂ حق کو زبانی یاد کر لیا جائے اس طرح کہ کلامِ خداوندی کی تلاوت فطرتِ ثانیہ بن جائے۔

قارئین کرام کی توجہ اس نکتے کی طرف دلائیں گے کہ ہم نے ''تلاوت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ متنِ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اسے صرف بہ آواز بلند پڑھنا کافی نہیں ہوتا۔ قرآن کے الفاظ کو احتیاط سے صحیح طور پر ادا کرنا ضروری ہے اور اس حسنِ ادا اور تجوید کے مخصوص قاعدے ہیں۔ اسلامی دنیا میں آپ کو بڑی تعداد ایسے بچوں کی ملے گی جو سارا قرآن یا اس کی درجنوں سورتیں خوش الحانی سے تلاوت کر سکتے ہوں گے مگر انہیں قرآنی الفاظ کے معانی کا سرے سے کوئی درک نہ ہو گا۔ اسلامی دنیا میں یہ قطعاً تعجب یا افسوس کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ تعلیم کا آغاز ایک بنیاد استوار کرنے سے ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ لہٰذا عمارت کی نیو دیکھ بھال کر مضبوطی سے رکھنا چاہیے۔ کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے بچوں کے آگے

پوری زندگی پڑی ہے۔ایسی دس زندگیاں بھی میسر آ جائیں تو بھی اس کتاب کے معانی کی پوری خبر لانے کے لیے کافی نہ ہوں گی کہ یہ خدا کا لافانی اور لامحدود و بے پایاں کلام ہے۔

جدید مغربی دنیا میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کو اپنی رفتار اور اپنی سطح کے مطابق سیکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ان کو جو پڑھایا جائے وہ بچگانہ ہونا چاہیے۔اسلام کے روایتی نظامِ تعلیم میں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ بچوں میں یاد کرنے کی ایک غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔یہ صلاحیت عطیۂ خداوندی ہے جسے بے کار، مہمل چیزیں پڑھا پڑھا کر برباد نہیں کرنا چاہیے۔زندگی یوں ہی لایعنی چیزوں سے پٹی پڑی ہے۔بچے ان فضولیات سے خود ہی ضرورت بھر استفادہ کر لیں گے۔رسمی تعلیم کے لیے وہ مقابلتاً نسبتاً تھوڑا سا وقت دے پاتے ہیں سو اسے اس کام میں صرف ہونا چاہیے جو زندگی میں اہم ترین اور سب سے لازمی چیز ہے، ہدایتِ خداوندی جس پر فلاحِ اخروی کا دارومدار ہے۔

قرآن حفظ کرنا کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا کہ اچھا استاد اسے ایک دلچسپ چیز بنا دیتا تھا۔بچے قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا سیکھتے اور اکثر اکٹھے مل کر سیکھتے۔مراد یہ کہ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے یہ ایسا ہی تھا گویا ایک مزے کا ترانہ یاد کر لیا یا کسی خوش آہنگ نغمے کا الاپ سیکھ لیا۔مل جل کر دہرانے اور آواز میں آواز ملانے کا لطف اپنی جگہ رہتا تھا۔دنیا بھر میں بچے یہ شغل کیا کرتے ہیں مگر اسلام میں بچوں کو اپنے یاد کیے ہوئے اس سرودِ خوش آہنگ کا احترام کرنا سکھایا جاتا ہے۔اس کی مذہبی نوعیت کے پیشِ نظر اسے سرود و صدا نہیں سمجھا جاتا بلکہ تلاوت کا نام دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی ساز شامل کرنا روا نہیں رکھا گیا حتیٰ کہ تالی

کی سنگت کی بھی اجازت نہیں ۔لیکن تلاوتِ قرآن کی بہر حال اپنی ایک موسیقی ہے، اس کی خوش نوائی سُر سے لبریز ہے کہ انسانی آواز کے حسنِ صوت سے بڑھ کر سازِ خوش آہنگ اور کوئی نہیں ہوتا۔

قرآن سے بچوں کو آئندہ علم حاصل کرنے کی ایک پختہ بنیاد فراہم ہو جاتی ہے۔ روایتی نصابِ تعلیم میں تدریجاً دیگر مضامین بڑھا دیئے جاتے تھے جن کا دارومدار بھی قرآن کے متن پر ہوتا تھا۔مثال کے طور پر قرآن کے معانی کا فہم حاصل کرنے کے لیے بچوں کو انبیاء کے قصے پڑھائے جاتے۔قرآن میں بیان ہونے والے قصصِ انبیاء کی تفصیلی شکل عام مسلم ثقافت کا مقبول حصہ شمار ہوتی ہے۔ ان مفصل کہانیوں میں قرآن کے علاوہ ہر طرح کے دوسرے مآخذ سے لے کر بہت سا مواد شامل کر دیا جاتا ہے۔سبھی مسلمانوں نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ، سیدنا محمدؐ اور دیگر انبیاء کی حکایات سن رکھی ہیں۔

رسمی تعلیم کی ایک اور سطح پر قرآن فہمی کے لیے عربی صرف نحو یا گرامر کو ایک اہم تقاضا سمجھا گیا ہے۔ایک مرتبہ طلباء کو سارا قرآن یا اس کا کچھ حصہ یاد کروا دیا جائے تو پھر صرف و نحو کے ہر قاعدے کی مثالیں ان کے حافظے میں ثبت ہو جاتی ہیں۔ان کے وسیلے سے اس پیچیدہ موضوع کے فنی مباحث اور باریکیوں پر عبور حاصل کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔طالب علم کے رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیگر مضامین کا تدریجاً اضافہ کیا جاتا ہے لیکن ایک بات ہمیشہ مانی جاتی ہے کہ رسمی تعلیم کا سب سے لازمی حصہ کلام اللہ کو زبانی یاد کرنا ہے خواہ اس کے معانی گرفت میں آئیں یا نہ آئیں۔اسی طرح کلام اللہ کے سب سے لازمی اجزاء وہ ہیں جن کو یاد کیے بغیر شعائر

دین کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ زور ہمیشہ ان اعمال پر دیا گیا ہے جو بدن کی حرکت سے انجام پذیر ہوتے ہیں کہ ہر انسانی عمل کا ناگزیر سہارا بدنِ انسانی ہی تو ہے، دل و دماغ کا مسکن بھی اور عمل کا وسیلہ بھی۔

چوتھی جہت

ہم نے حدیثِ جبرئیل کے آخری حصے پر ابھی تک گفتگو نہیں کی۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس حصے میں آنحضرتؐ نے دنیا کے آخری زمانے کی نشانیوں کے بارے میں ایک رمزیہ انداز میں کچھ بیان کیا ہے مثلاً لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے گی۔ بہت سی دیگر احادیث اور بعض قرآنی آیات کا اسلوبِ بیان بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ جاننا بھی دین کا حصہ ہے کہ زمانے کا ڈھنگ کس طرح بدلے گا اور کیونکر اپنے خاتمے کو پہنچے گا۔ سو یہ حوالہ بنتا ہے اسلام کے تصورِ تاریخ کا۔ چہار سمتوں کے اقلیدسی استعارے میں زمانہ چوتھی اُور سے عبارت ہے۔ اس نمونے کو سامنے رکھیے تو اسلام کے تصورِ زمان اور تصورِ تاریخ کے بارے میں ''الدین'' کی چوتھی جہت کے طور پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ہستیِ انسانی کی مختلف سمتوں اور جہتوں سے زمانے کا کچھ نہ کچھ تعلق تو ہے ہی کہ ہر آدمی کی ایک ابتداء ہے اور ہر کسی کو اپنی انتہا کو پہنچنا ہے۔

اس کتاب کا بڑا حصہ اسلام کی وضاحت پر مشتمل ہے، اسلام بحیثیت تسلیم و اطاعت، از لحاظِ ایمان اور از روئے احسان۔ اختتامی حصے میں ہم البتہ اسلام کے تصورِ تاریخ سے برآمد ہونے والے چند نتائج پر نظر ڈالیں گے۔ تاہم یہ بحث ان

جدید کتبِ تاریخ میں پائی جانے والی تاریخ سے بالکل الگ ہو گی جن کا تصورِ کائنات سرتاسر عقلیت پرستی کا اسیر ہے۔اور عقلیت پرستی بھی اس قبیل کی جو حال ہی میں نمودار ہوئی ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے تاریخ میں معنویت قدرتِ خداوندی کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے، اسی سے ہمارے آغاز و ابتداء کا بامعنی بیان میسر آتا ہے اور اسی سے ہمارے حال و انجام پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔
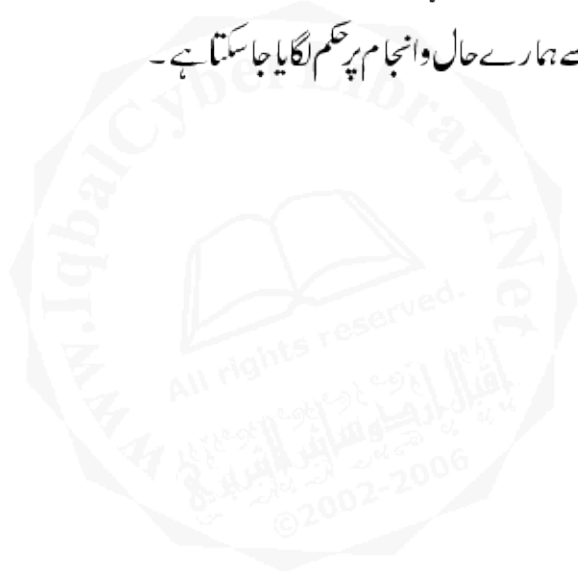
حصہ اوّل

اسلام

اسلام

عربی میں ''اسلام'' کے معنی ہیں ''تسلیم کرلینا، اپنا آپ سپرد کردینا، سرافگندگی، کسی چیز کو مان کر قبول کرنا''۔ دینی اصطلاح میں کہیے تو اسلام اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے یا منشائے خداوندی کے سامنے جھک جانے کا ہم معنی ہے۔ لگ بھگ ستر آیات میں قرآن نے یہ لفظ یا اس سے بننے والے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان میں سے صرف چند آیات کے بارے میں یہ دعویٰ ہوسکتا ہے کہ ان میں ''اسلام'' کا لفظ اپنے خاص معنی میں آیا ہے یعنی اس سے مراد وہ دین ہے جو قرآنِ مجید اور سیدنا محمدؐ کے وساطت سے اس دنیا میں قائم ہوا۔

صفحاتِ سابق میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ''دین'' کا لفظ گونا گوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اسلامی روایت اور قرآن میں اہم الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں یہ ایک عام بات ہے۔ لوگوں کے مابین اکثر اسی کارن غلط فہمی جنم لیتی ہے کہ وہ ایک مشترک لفظ بول کر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ ایک ہی حقیقت کے بارے میں بات کر رہے ہیں جبکہ اصل میں ان کے درمیان صرف لفظوں کا اشتراک ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب غیر مسلم حضرات اسلام کا لفظ

بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد دینِ محمدی ہوتا ہے۔ مسلمان بھی اس لفظ سے اسی طرف اشارہ کرتے ہیں تاہم ان کے ذہن میں اکثر اس اصطلاح کے دیگر مفاہیم بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔

''اسلام'' کے وسیع اور سب سے عام معنی ''اللہ کے سامنے سرافگندگی و اطاعت'' کے ہیں جو ہستی کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ صحیح معنی میں حقیقی ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہی اصل میں حقیقی ہے اور اسی کو حقیقت کہنا زیبا ہے تو پھر اس کے سوا ہر چیز اصل میں حقیقی نہ ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، اس کے سوا ہر شے اپنی حقیقت کے لیے اس کی محتاج ہے۔ بات کو فلسفیانہ انداز میں کہنے کی بجائے اگر کلامی زبان میں بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز اللہ کی تخلیق ہے۔ اللہ ہی نے کائنات اور اشیائے کائنات کو اس طور بنایا ہے لہٰذا ان کا دارومدار مکمل طور پر اللہ ہی کی ذات پر ہے۔ بنا بریں ہر شے اللہ کے سامنے سرافگندہ اور مطیع ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں اوّلین آیت ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ اس میں اسلام کا لفظ اپنے وسیع اور عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آیت اس بات کا بیان ہے کہ سچا دین صرف اللہ ہی کا دیا ہوا اور قائم کیا ہوا ہوتا ہے۔ دیگر آیات میں قرآن کا یہ نقطۂ نظر بیان ہوا ہے کہ عالمِ طبعی کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کرتی ہے۔ تمام مخلوقات اپنی زبانِ ہستی سے، محض اپنے ہونے سے ہی اپنے خالق کی عظمت اور تمجید کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور اس طرح وہ عمل سرانجام دے رہی ہیں جس سے ان پر اللہ کی حاکمیت کا اثبات ہو رہا ہے:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (۳:۸۳)

اب کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کچھ اور دین ڈھونڈتے ہیں؟ حالانکہ زمین و آسمان میں جو کوئی ہے اسی کے حکم میں ہے، خوشی سے یا زور سے خواستہ یا ناخواستہ۔ اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ (۲٤:٤١)

تو نے دیکھا نہیں کہ جو کوئی بھی ہیں آسمان و زمین میں اور پر کھولے ہوئے اڑتے جانور سب اللہ کی یاد کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ (۲۲:۱۸)

تو نے دیکھا نہیں کہ جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے آدمی بھی، اللہ کو سجدہ کرتے ہیں

غور فرمائیے کہ یہاں ذکر ہے ''کثیر من الناس'' یعنی انسانوں میں سے بہتیرے لوگوں کے سجدہ کرنے کا۔ اس کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ اس کے سامنے نہیں جھکتے۔ ایک نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بنی نوع انسان بھی ''ارض و سماء'' میں شامل ہیں، مخلوق خداوندی ہیں اور اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں جبکہ دوسرے اعتبار سے وہ با اختیار ہیں کہ اللہ کی اطاعت سے روگردانی کر لیں۔ یہ ایک بڑا معمہ ہے۔

اسی سے انسان کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ آدمی درخت اور پہاڑ کی مانند نہیں ہوتا کہ امر خداوندی کو قبول کر لے اور اس کے بارے میں کچھ نہ سوچے۔ انسانوں کو ہر دم اپنی آزادیِ انتخاب اور اختیار کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ انہیں اگر کوئی کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ ماننے یا انکار کرنے کے مابین چناؤ کر سکتے ہیں خواہ حکم دینے والا ربِ کائنات ہو، والدین ہوں، حکومت وقت ہو یا کوئی اور۔ اگر انسان کے سامنے بساطِ احکامات میں سے انتخاب کی آزادی نہ ہوتی تو پھر سب سہل تھا کہ اس صورت میں کسی دوسری راہِ عمل کا تصور کرنے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔

مذکورہ آیت میں قرآن نے ''انسانوں میں سے بہت سے لوگوں'' کے اللہ کے سامنے جھک جانے کا ذکر کیا ہے۔ انہیں قرآن نے اکثر ''مسلم'' کے لفظ سے یاد کیا ہے یعنی وہ لوگ جو منشائے خداوندی کے سامنے جھک گئے۔ عام طور پر ''مسلم'' کے معنی اس شخص کے ہوتے ہیں جو قرآن کے لائے ہوئے دین کا پیروکار ہو لیکن قرآن کے حوالے سے دیکھیے تو اس سے ان لوگوں کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جو اللہ کے نبیوں، رسولوں میں سے کسی ایک کی پیروی کرتے ہیں۔ درج ذیل آیات دیکھیے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۲:۱۳۱)

جب اس کے رب نے اس سے کہا، حکم بردار ہو جاؤ۔ وہ بولے، میں پروردگار جہان کے حکم میں آیا۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ

وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ

(۲:۱۳۳)

کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کی موت سامنے آ کھڑی ہوئی اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم بندگی کریں گے۔ آپ کے رب کی اور آپ کے باپ دادوں، ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق کے رب کی، وہی ایک رب۔ ہم اس کے حکم پر ہیں۔

وَاِذۡ اَوۡحَیۡتُ اِلَی الۡحَوَارِیّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَبِرَسُوۡلِیۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَاشۡهَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ (۵:۱۱۱)

اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر یقین کرو۔ بولے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔

تمام انبیاء منشائے ایزدی کو تسلیم کرنے والے اور اللہ کے اطاعت گزار تھے اور اس لحاظ سے ''مسلم'' تھے۔ اسی طرح وہ تمام لوگ جو نبیوں اور رسولوں کے لائے ہوئے ادیان کو مانتے ہیں انہیں مسلمان ہی کہا جائے گا۔ اس کے یہ معنی البتہ نہیں ہو سکتے کہ وہ سبھی قرآن کے بنا کردہ اس دین کے پیروکار ہیں جو ساتویں صدی عیسوی میں سرزمین عرب میں ظہور پذیر ہوا۔ سو اگر اس لفظ کو اس کے خاص معنی میں لیں تو اس سے تاریخ کے اس مظہر کی طرف اشارہ مقصود ہو گا جو ہمارے کتاب کا موضوع ہے یعنی وہ دین جس کا عنوان ''اسلام'' ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآن میں آٹھ مقامات پر اسلام آیا ہے۔ ان تمام آیات میں کہیں بھی اسلام کے لفظ سے کسی خاص دین کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ اس قرآنی اصطلاح کا وسیع پس منظر

ملحوظ رہا ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکثر مسلمان ان آیات سے تاریخی اسلام ہی مراد لیتے ہیں اور ان کی نظر اس لفظ کے وسیع تر معانی کی طرف منتقل نہیں ہو پاتی لیکن جونہی ان آیات کا قاری اس وسیع سیاق وسباق سے آگاہی حاصل کرتا ہے جو قرآن کا مقصود ہے تو اس پر یہ بات کھلنے لگتی ہے کہ ان آیات کے ایک سے زیادہ معانی ہیں۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳:۱۹)

دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی، حکم برداری۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَالْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (۳:۸۵)

اور جو کوئی چاہے حکم برداری کے سوا اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ان دو آیات میں مذکور الفاظ ''دین'' اور ''الاسلام'' کو کشادہ و تنگ ہر دو معنی میں لیا جا سکتا ہے۔اکثر مسلمان اس کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ عملِ صحیح اور راست بازی کا اصل پیمانہ وہی ہے جس کو قرآن و حدیث نے مقرر کر دیا۔دیگر قارئین کی فہم کے مطابق ان آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر الہامی دین ''اسلام'' کی ایک شکل ہے جیسے تمام انبیاء کا پیغام ایک ہی تھا یعنی ''توحید''۔دینِ خداوندی یعنی تسلیم و اطاعت کا پیغام ''اسلام'' سبھی انبیاء اور رسولوں پر نازل کیا گیا۔اب اگر کوئی شخص اس دینِ خداوندی کو رد کر کے انسانوں کا گھڑا ہوا کوئی نسخہ اپنا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کریں گے۔آپ کے اختیار کردہ دین کا اللہ کے ہاں باریاب نہ ہونا اور واصلِ جہنم ہونا ایک ہی بات ہے۔

جن آیات میں ''اسلام'' کا ذکر آیا ہے ان میں سے چند مقامات پر اسے

صراحتاً دینِ محمدیؐ ہی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے **دلیل** یہ ہے کہ آیات میں آپؐ کا ذکر موجود ہے:

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ (۴۹:۱۷)

تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ مسلمان ہو گئے۔ کہیے، مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان مت دھرو۔ بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی راہ دکھائی۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۵:۳)

آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا، اور پسند کیا میں نے تمہارے لیے دین، مسلمانی۔

اسی طرح اور بھی کئی آیات ہیں جن میں ''اسلام'' یا ''مسلم'' کے الفاظ سے اشارہ اسلامِ تاریخی ہی کی طرف مقصود ہے۔ ایک آیت میں تو اس لفظ سے مراد ایک اور مفہوم ہے جو دیگر مفاہیم سے بھی محدود تر اور ایک خاص پس منظر کی طرف اشارہ کناں ہے۔ صحرا نشین بدو قبائل کے افراد میں سے ایک گروہ نے یہ جان لیا تھا کہ نیا دین ان کے علاقے کی روز افزوں قوت بنتا جا رہا ہے اور اس سے سازگاری پیدا کر کے وہ بہت سے فوائد سمیٹ سکتے ہیں۔ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے اور عربوں کے قدیمی انداز میں عہدِ اطاعت کا اعلان کیا۔ اب اسلام اپنے ماننے والوں سے کچھ ایسے تقاضے کرتا تھا جو ان بادیہ نشینوں کے لیے سراسر نامانوس تھے۔ ان پانچ ارکان کا ذکر حدیثِ جبرئیل میں آ چکا ہے۔ آنحضرتؐ سے بیعت کرنے کا

ایک حصہ یہ بھی تھا کہ عہدِ اطاعت کرنے والا ان عبادات کی پابندی کا وعدہ بھی کر رہا ہے۔ بیعت ہو چکی تو یہ مردانِ صحرا آپؐ سے کہنے لگے کہ وہ اسلام پر ایمان لے آئے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچتے ہی گفتگو میں ایک سمت سے روک آ جاتی ہے۔ اللہ کی طرف سے آنحضرتؐ پر وحی آ رہی ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹:۱۴)

یہ اعرابی گنوار کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہیے، تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔ رہا ایمان تو اس کا ابھی تمہارے دلوں میں گزر بھی نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔

اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ اسلام لانا اور ایمان ایک ہی چیز نہیں ہے۔ تسلیم و اطاعت تو خدا اور اس کے نبی کی فرمانبرداری کا نام ہے لیکن ایمان اس سے گہری بات ہے کیونکہ اس کا تعلق علم اور اخلاص فی العمل سے ہے۔ اس پر گفتگو آگے چل کر ہو گی۔ خدا اور اس کے رسول کا حکم ماننا دائرہ عمل سے متعلق ہے، یہ اوامر و نواہی کی اقلیم ہے۔ آنحضرتؐ لوگوں کے لیے اللہ کی متعین ہدایات و احکامات لے آئے تھے۔ اگر وہ رسولِ خداؐ کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ کا حکم بجا لاتے ہیں۔ "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" (۴:۸۰) (جس نے حکم مانا رسول کا، اس نے حکم مانا اللہ کا) اور اس کے لیے اللہ انہیں اس اطاعت کا اجر دے گا۔

لفظ "اسلام" کے یہ چوتھے معنی ہمارے اس باب کا موضوع ہیں۔ احادیث

میں اس کی تفصیل بہت وضاحت سے موجود ہے۔ لہٰذا حدیثِ جبرئیل جب ''اسلام'' کی تعریف متعین کرتی ہے تو اس ضمن میں اعمال کی ایک فہرست سامنے آتی ہے اگر انسان کو اللہ کا حکم بجا لانا ہے تو ان کو انجام دینا لازم ہے:

اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر وہاں جانے کی استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو

خلاصہ یہ کہ ''اسلام'' کے لفظ کے چار بنیادی مفاہیم ہیں' کشادہ ترین سے لے کر محدود و مخصوص معنٰی تک۔

۱) تمام مخلوقات کی اپنے خالق کے سامنے سرافگندگی اور تسلیم و اطاعت۔

۲) انسان کا انبیاء کے وسیلے سے نازل کردہ ہدایتِ خداوندی قبول کرنا۔

۳) رسولِ خدا سیدنا محمدؐ کے ذریعے ہمیں جو ہدایتِ خداوندی نصیب ہوئی اسے تسلیم کرنا۔

۴) سیدنا محمدؐ کے پیروکاروں کا اللہ کے نازل کردہ احکامات کو ماننا۔

ان میں سے صرف تیسرے مفہوم کو ''اسلامِ تاریخی'' کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔

یہ مت جانیے کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ چار مفاہیم اپنا الگ اور واضح مفہوم رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو دینی ماحول میں رہتے ہیں ان کے ہاں یہ معاملہ اور بھی مبہم ہے۔ مسلمانوں میں یہ بہت عام بات ہے کہ وہ اسلام کو اپنے عمل کا مترادف سمجھتے ہیں اور دیگر ادیان کی عبادات و ارکان کو بھی اپنے اعمالِ دینی ہی کے مشابہ

سمجھتے ہیں (کیونکہ سبھی ادیان ''اسلام'' ہیں)۔ اگر دوسرے ادیان میں دینی اعمال کچھ اور طرح کے ہیں تو اس کا سبب لازماً یہ ہے کہ ان میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوگیا ہے۔ اسی طرح روایتی مسلمانوں میں یہ خیال بھی عام ہے کہ ان کے مراسمِ دینی ہی کائنات کے سب سے فطری اور معیاری دینی عمل ہیں کیونکہ وہ بھی عالمِ مخلوقات کی ہر شے کی طرح دائماً مصروفِ اطاعت ہیں کہ ''زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کا مطیع و فرمانبردار ہے''۔ بالفاظِ دیگر یہ کہیے کہ اس اصطلاح کے مختلف معانی آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور باہم ایک دوسرے میں یوں مدغم معانی کو جدا کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوا کرتا۔[۲۲]

باب اوّل

ارکانِ دین

ستون سہارا دیتا ہے۔اس پر عمارت استوار کی جاتی ہے۔عمارت دینِ اسلام ہے اور اس کی تین جہتیں ہیں۔اگر اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کو "ستون" کہا گیا ہے تو اس میں مضمر یہ ہے کہ ہر دوسری چیز کی بنا انہی ستونوں پر رکھی گئی ہے۔

عمل: اطاعت کی تجسیم

افعال و اعمال جسم کا خاصہ ہے۔حقیقت کی دنیا میں ہمارا تعین ہمارے جسم سے ہوتا ہے اور اس کی حدود اتنی وسیع ہیں کہ ایسے لوگ آپ کو ہمیشہ مل جائیں گے جن کا دعویٰ ہے کہ انسان کا بدن ہی ہستی کا حاصل ہے، اس کے علاوہ دنیا میں اور رکھا کیا ہے۔اہمیت ہے تو اسی کی۔قرآنِ مجید نے بسا اوقات اس قبیل کے لوگوں کی تنقید کا حوالہ دیا ہے۔ان کی تنقید کا ہدف وہ لوگ تھے جو رسولوں اور انبیاء کی پیروی کرتے تھے:

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۔ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۔ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۔ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۲۳:۳۴-۳۷)

اور اگر کہیں تم اپنے جیسے ایک آدمی کے کہے پر چلے تو تم بے شک خراب ہوئے۔کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو

گئے تو تم کو پھر سے نکالا جائے گا۔ کہاں ہوسکتا ہے! کہاں ہوسکتا ہے! یہ جو تم سے وعدہ ہو رہا ہے۔ دنیا میں بس یہی ہمارا جیون ہے۔ مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اٹھنا نہیں۔

ہستیِ انسان کے لیے اگر جسمِ انسانی کی ایسی گہری اہمیت نہ ہوتی تو لوگ اس انداز میں سوچا نہ کرتے۔ لیکن ہمارا بدن ہی ان تمام انفرادی خصائص کو متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے جس سے ہمارا تشخص جنم لیتا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے ہمارے رابطے کا آغاز بدن ہی کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ حواس اس کا واسطہ بنتے ہیں۔ فلسفی اور علمِ کلام کے لوگ غیر جسمانی موجودات کا ذکر کیا کرتے رہتے ہیں۔ بچوں اور نا سمجھ لوگوں کے لیے یہ بے معنی باتیں ہیں۔

معاشرے کی تعمیر ابتداء ہی سے اسلام کے پیشِ نظر رہی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ مشترکہ آدرش اگر لوگوں کو آپس میں متحد رکھتے ہیں تو اسی طرح عمل کا اشتراک بھی انہیں ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ سماجی اعتبار سے اسلام کا کام انسانوں کے عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

بدن ہر انسان کے لیے ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے لیکن غیر مادی اور غیر جسمانی وجود اکثر لوگوں کے لیے نا قابلِ فہم ہوتا ہے۔ ان کا سوال ہوتا ہے ''ہمیں دکھاؤ کہاں ہے یہ''؟ قرآن اس کے جواب میں صرف یہ کہتا ہے کہ نجاتِ اخروی ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو ''ان دیکھے پر ایمان لاتے ہیں''۔ اس سطحِ اوّلین پر لوگوں سے غیب کو سمجھنے اور جاننے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ انہیں صرف یہ ماننا چاہیے کہ عالمِ غیب بھی موجود ہے اور اس لحاظ سے عمل کرنا چاہیے، دین کے پانچ بنیادی ارکان کی پابندی کرنا چاہیے اور وحی کی ہدایت کے مطابق دیگر کام سرانجام دینے

چاہیں۔

اکثر لوگوں کے لیے ان کا دین وہی ہوتا ہے جو پیدائشی طور پر ان کو ورثے میں ملا ہوتا ہے۔ اسلام اس بات سے آگاہ ہے کہ عملِ صالح سے لوگ مسلمان بنتے ہیں اور جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے، عملِ صحیح ہی سے ایمانِ صحیح پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان بچوں کو شاید ہی کبھی عقائد کا آموختہ یاد کروایا جاتا ہوگا۔ انہیں نماز پڑھنے اور دیگر شعائرِ دین کی پابندی کی تلقین کی جاتی ہے۔ وہ طہارت کے اصولوں کو سیکھتے ہوئے پروان چڑھتے ہیں کہ اسی سے بدن کی صفائی کی تربیت ہوتی ہے۔ نیز بچوں میں یہ بات بھی عام ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی انہی کے طریقوں کی نقل کرتے ہیں اور اس میں مزا لیتے ہیں سو اکثر اوقات آپ انہیں نماز کی نقل کرتے دیکھیں گے۔ ان کے والدین یا دوسرے افرادِ خانہ عبادت کر رہے ہوں تو وہ بھی شامل ہو جائیں گے۔ کسی کو اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ ادھ بیچ میں نماز چھوڑ کر کھیل کود میں لگ گئے ہیں۔ مقصود صرف اتنا ہے کہ یہ دینی مراسم اور اعمال رفتہ رفتہ ان کے لیے فطری چیز بن کر انسانی ساخت و پرداخت کا جیتا جاگتا حصہ بن جائیں۔

عمل اور کثرتِ عمل پر جو اتنا زور دیا جاتا ہے تو اس کے پسِ پشت یہ احساس کارفرما ہے کہ قرآن ہمارے گوشت پوست اور لہو کا جزو بن جائے۔ صرف اسے پڑھنا یا یہ جاننا کافی نہیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ مسلمان کو قرآن کا پیکرِ عمل بننا درکار ہے۔ قرآن کو وہ حقیقت ہونا چاہیے جس سے ان کے عمل (اسلام) ان کی فکر (ایمان) اور ان کی نیت (احسان) کا تعین ہوتا ہو۔

رکنِ اوّل۔شہادت

ارکانِ دین عمل کا حصہ ہیں یعنی ان کی تعریف بطور عمل متعین کی گئی ہے اور انہیں ایک عمل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔آپ مسلمان ہونے کے لیے کیا کرتے ہیں؟اس سوال کا تعلق نہ تو ایمان کی سطح سے ہے،نہ فکروفہم سے نہ ہی نیت کی معاملے سے۔اس سطح کے سوالات اسلام کی دوسری یا تیسری جہت کا موضوع ہیں،پہلی کا نہیں۔

رکنِ اوّل وہ بنیادی عمل ہے جس پر تمام اسلامی اعمال کا دارومدار ہے۔یہ کیا ہے؟یہ زبان سے اقرار ہے اس بات کا کہ ہم اللہ کی حقیقت اور سیدنا محمدؐ کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں قرآن جسے سیدنا محمدؐ لے کر آئے اسے سچا پیغام جانتے ہیں۔اس رکن کو عربی میں ''الشہادۃ'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے تصدیق کرنا،شہادت دینا،اعلانیہ قبول کرنا۔

قرآن میں اس لفظ''شہادۃ'' کا استعمال جس طرح ہوا ہے اس سے اس کی معنویت روشن ہو جاتی ہے۔اس کا مطالعہ دلچسپ ہے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو نام بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک ہے۔''عالم الغیب والشہادۃ''(کھلے اور چھپے کا جاننے والا)۔غیب کا مطلب ہے ''اوجھل،ان دیکھا،چھپا ہوا،مستور اور غیر مرئی''۔شہادۃ اس سیاق وسباق میں ''مشہود،ظاہر اور دیکھے ہوئے'' کے معنی دیتا ہے۔اسمائے الٰہی میں سے اس لفظ کو برت کر اور دیگر مقامات پر اور کچھ اسالیب کے استعمال سے قرآن حقیقت کو دو اقالیم میں،دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ایک وہ جو ہمارے حواس سے اوجھل اور ان کی گرفت سے باہر ہے اور دوسری اقلیم وہ جس کی

شہادت ہمارے حواس کو میسر ہے۔ہم صرف اپنے جہانِ مشہود کو جانتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ غیب اور شہود دونوں کا جاننے والا ہے۔اقلیمِ غیب میں اللہ اور تمام موجوداتِ روحانی شامل ہیں۔عالمِ شہادت میں جسم رکھنے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک اور نام ''الشہید'' بھی ہے یعنی شہادت دینے والا (The Witness) کہ اللہ تعالیٰ وقوع پذیر ہونے والی ہر شے کا شاہد ہے کہ قرآن کا بیان ہے۔

وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ

(٥٧:٤)

اور وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو۔

اَللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَایَفْعَلُوْنَ (١٠:٤٦)

اللہ ان کے ہر کیے ہوئے کا شاہد ہے۔

اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (٤١:٥٣)

کیا تیرے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں؟

قرآن میں شہادۃ کا لفظ اکثر شہادت دینے، گواہ رہنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔مثلاً لوگوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب کوئی شخص قرض لے تو دو گواہ موجود رہیں اور سارے معاملے کو تحریر کر لیا جائے کہ

ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاَقْوَمُ لِلشَّھَادَۃِ (٢:٢٨٢)

اس میں اللہ کے ہاں خوب انصاف ہے اور اس سے گواہی درست رہتی ہے۔

توحیدِ الٰہی کی شہادت یا گواہی دینا مسلمانوں کا سب سے اساسی عمل ہے، اس

شہادت کی ادائی انہیں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے عمل کا نقش اپنے اندر اتارنے کا موقع فراہم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ بھی تو شہادت دیتے ہیں۔ اس طرح انسان ان ہستیوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے جنہیں علم عطا کیا گیا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳:۱۸)

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے۔ وہی حاکم ہے انصاف والا ہے۔ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ زبردست ہے حکمت والا۔

اسلام کا رکنِ اوّل اپنی مختصر شکل میں فقط اتنا ہے کہ آپ دو فقرے اپنی زبان سے ادا کر دیں 'لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ' (اللہ کے سوا الٰہ اور کوئی نہیں) اور 'محمدٌ رسول اللہ' (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں)۔ ان سے پہلے عموماً ''اشھدان'' کے کلماتِ شامل کیے جاتے ہیں۔

نظری طور پر تو مسلمانوں کے لیے زندگی بھر میں ایک ہی مرتبہ کلماتِ شہادت کا زبان سے ادا کرنا ضروری ہے مگر عملاً یوں ہوتا ہے کہ مسلمان ان کلمات کو کثرت سے وردِ زبان رکھتے ہیں کچھ اس لیے بھی کہ یومیہ فرض نمازوں میں بھی ان کلمات کو شامل رکھا گیا ہے۔ روایتی طور پر نوزائیدہ بچے کے کان میں بچے کا والد کلمۂ شہادت پڑھتا ہے گویا بچہ اپنی زندگی کا آغاز ہی دین کے رکنِ اوّل سے کرتا ہے۔ مسلمان ہر طرح کے مواقع پر اس کلمہ کو ادا کرتے ہیں اور بچے کو اوائلِ عمر ہی میں کلمہ پڑھنا سکھا دیا جاتا ہے۔ یہ توقع کسی کو نہیں ہوتی کہ بچہ کلمۂ شہادت کو سمجھ کر پڑھ رہا ہے۔ کلمہ پڑھنے کا عمل ہی ایک اہم کام ہے۔

کلمۂ شہادت کی اہمیت بہت بنیادی ہے اور اس بات سے عیاں ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھنا ہی وہ مذہبی عمل ہے جسے انجام دے کر آپ اپنا آپ اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں یعنی مسلمان ہو جاتے ہیں۔اس رسم کو ادا کرتے ہوئے کلمہ عربی میں پڑھنا ضروری ہے اس نیت سے کہ آپ اللہ کے حضور تسلیم و اطاعت کا اقرار کر رہے ہیں۔ اس عمل کے دو مسلمان گواہ ہونا بھی ضروری ہیں۔اکثر مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ کلمۂ شہادت کا اعلان و اقرار اس بات کے لیے پوری طرح کافی ہے کہ آپ کو بارگاہِ الٰہی میں بطور مسلمان قبول کر لیا جائے۔تاہم اس پر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اگر معاملہ صرف زبان تک محدود ہے تو آپ کا اسلام اخلاص، سچائی اور دیانت سے عاری کہلائے گا۔کلمۂ شہادت پڑھنے سے باقی چار ارکان آپ پر فرض ہو جاتے ہیں۔اب اگر آپ ان کے ادا کرنے میں کوتاہی کریں تو آپ کا اسلام نا قابلِ قبول نہ سہی تو ادھورا ضرور ہوگا۔

رکنِ دوم۔نماز

کلمۂ شہادت پڑھنا اگرچہ مسلمان کا بنیادی عمل ہے تاہم نماز ادا کرنا ایک اعتبار سے کہیں زیادہ اساسی قرار دیا جا سکتا ہے۔آنحضرتؐ نے نماز کو ''عماد الدین'' (دین کا مرکزی ستون) کا نام دیا ہے گویا ایک خیمہ ہو جسے درمیان سے ایک اکیلے بانس نے اٹھا رکھا ہو اور اس کے علاوہ جو اڑواڑ بھی خیمے کو دی گئی ہو اس کی حیثیت ثانوی ہو۔قرآن میں اور ہر کام سے بڑھ کر نماز ادا کرنے کا حکم آیا ہے اور احادیث نبویؐ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے عمل میں نماز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ نمازِ باجماعت آج ٹی وی پر اسلام کی علامت کے طور پر دکھائی جاتی ہے۔ٹی وی کے پروڈیوسر حضرات کے لیے تو شاید اس کی وجہ اتنی ہی

رہی ہو گی کہ اس میں ایک مجمع نظر آ جاتا ہے تاہم مسلمانوں کے لیے نماز ایک ایسا عمل ہے جو اور ہر کام سے بڑھ کر اسلام کو مجسم کر کے سامنے لے آتا ہے اور دکھا دیتا ہے کہ مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے۔ مسلمانوں نے نماز کو ہمیشہ اسی حیثیت سے جانا ہے۔

قرآن کی دیگر اصطلاحات کی طرح ''صلاۃ'' کے بھی متعدد مفاہیم ہیں۔ عربی میں اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''دعا'' یا ''برکت دینا'' to pray or bless۔ خدا اور اس کے فرشتے جس طرح شہادت دیتے ہیں اسی طرح صلوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اتباع میں انسان اللہ کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں اسی طرح اس کی پیروی میں نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ چار اسالیب میں برتا گیا ہے۔ اولاً، خدا اور ملائکہ ایک صلاۃ بھیجتے ہیں جس سے وہ بندگانِ خدا پر نزولِ برکات و رحمت کرتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَٰئِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَٰتِ إِلَى النُّورِ (٣٣:٤٣)

وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے، تاکہ تم کو اندھیروں سے اجالے میں نکالے۔

دوم: ارض و سماء کی تمام مخلوقات 'صلاۃ' ادا کرتے ہیں۔ یہ ان کے اسلامِ کائناتی کا اظہار ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَٰفَّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ (٢٤:٤١)

تم نے دیکھا نہیں کہ زمین و آسمان میں جو کوئی ہیں اللہ کی یاد کرتے ہیں اور

پر کھولے ہوئے اڑتے جانور۔ ہر ایک نے اپنی طرح کی بندگی اور یاد جان رکھی ہے۔

سوم: ہر ''مسلم'' جو اپنے ارادے و اختیار سے اسلام لایا 'صلاۃ' ادا کرتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ یہاں اس اصطلاح کا اطلاق مراسم عبودیت کی ان مخصوص صورتوں میں سے ایک پر ہوتا ہے جو تمام انبیاء پر نازل کی گئیں۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوطاً اِلَى الاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوبَ نَافِلَةً وَكُلاًّ جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ

(۲۱:۷۱-۷۳)

اور ہم اسے اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے اہلِ جہان کے لیے برکت رکھی۔ ہم نے اسحٰق اسے بخشا اور یعقوب اسے انعام میں دیا اور سب کو نیک بخت کیا۔ اور ان کو ہم نے پیشوا بنایا، ہمارے حکم سے راہ دکھانے والے۔ اور کہ بھیجا ان کو نیکی کرنے کا، نماز قائم کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا۔ اور وہ ہماری بندگی میں لگے ہوئے تھے۔

آخرین: اس کا سب سے عام استعمال یہ ہے کہ اس سے عبادت کی وہ صورت مراد ہو جو اسلام کا دوسرا رکن ہے یعنی صلاۃِ مکتوبہ۔ قرآن نے مسلمانوں کو نماز ادا کرنے کا حکم بار بار دیا ہے مگر نماز پڑھنے کے لیے اصل میں کرنا کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں بہت کم مذکور ہے۔ نماز ادا کرنے کا طریقہ رسولِ خداؐ نے سکھایا۔ سو مسلمان آج کہیں کے بھی باشندے ہوں نماز بنیادی طور پر اسی طرح ادا کرتے ہیں جیسے

آنحضرتؐ نے پڑھی اور جس طرح مسلمانوں کو پڑھنے کی تلقین کی۔ سطورِ ذیل میں ہم نماز ادا کرنے کا عمومی انداز بیان کریں گے۔ اس ضمن میں فقہِ اسلامی کے مکاتبِ فکر میں چند معمولی اور ضمنی اختلافات موجود ہیں۔ ان کی طرف اشارہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔

نماز کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ فرض اور نفل نماز۔ فرض نماز دین کا دوسرا رکن ہے۔ نفل نمازیں مختلف مواقع کے لیے بتائی گئی ہیں۔ صلاۃِ مکتوبہ یا فرض نماز دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ اس کے اور بھی مواقع ہیں مثلاً جمعہ کی نماز با جماعت۔ غروبِ آفتاب کے بعد اور شفق سے روشنی کے آخری آثار مٹ جانے سے پہلے مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ پانچ یومیہ نمازوں میں سے یہ پہلی نماز ہے۔ ۲۳؎ دوسری نماز رات کی یا عشاء کی نماز ہے۔ اس کے اوقات نمازِ مغرب کے اختتام سے لے کر نمازِ صبح کے وقتِ آغاز تک ہیں۔ نمازِ صبح یا نمازِ فجر کا وقت طلوعِ سحر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے۔ ۲۴؎ چوتھی نماز ظہر، دوپہر اور سہ پہر کے درمیان پڑھی جاتی ہے۔ دوپہر یا نیم روز وہ ساعتِ آفتاب ہے جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے۔ گھڑی کا آدھا دن اور سورج کا نصف یوم الگ الگ ہوتے ہیں۔ سہ پہر کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کا سایہ اس سے قدرے بڑھ جائے۔ پانچویں نماز یعنی نمازِ عصر کا وقت سہ پہر سے لے کر غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔

ہر نماز کی چند مقررہ رکعتیں ہوتی ہیں۔ شام کی نماز کی رکعتیں تین ہیں۔ نمازِ شب میں چار، نمازِ صبح کی دو، نمازِ ظہر کی چار اور نمازِ عصر کی رکعتیں بھی چار ہیں۔ ہر رکعت میں کچھ مخصوص افعال ہوتے ہیں قرآنِ مجید میں سے کچھ حصے کی تلاوت کی

جاتی ہے نیز چند روایتی کلمات ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ سب عربی میں ہوتا ہے۔

اگر آپ چند لوگوں کو مل کر جماعت سے نماز پڑھتے دیکھیں تو آپ کے مشاہدے میں مندرجہ ذیل باتیں آئیں گی (ان میں علاقے علاقے کا معمولی سا فرق واقع ہوسکتا ہے) نماز پڑھنے والے سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دو ایک منٹ بعد وہ پشت سیدھی رکھتے ہوئے آدھے دھڑ سے جھک جاتے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذرا دیر بعد وہ گھٹنے، ہاتھ اور ماتھا زمین پر ٹیک کر سجدہ کرتے ہیں۔ چند لمحے سجدے کی اس حالت میں رہ کر وہ اٹھ کر بیٹھتے ہیں اور پھر دوبارہ پیشانی زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ یوں ایک رکعت ختم ہوئی۔

سجدے سے سر اٹھا کر وہ دوبارہ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسری رکعت کا آغاز کرتے ہیں۔ دوسری رکعت بھی عین پہلی کی طرح ہوتی ہے۔ دوسری رکعت کے آخر میں اٹھ کر کھڑا ہونے کے بجائے وہ بیٹھ جاتے ہیں اور رسولِ خدا اور اہلِ ایمان پر صلوات و سلام پڑھتے ہیں۔ یہاں انہیں کلمہ شہادت ایک قدرے طویل صورت میں پڑھنا ہوتا ہے۔

اگر نمازِ صبح یا نمازِ فجر کا معاملہ ہو تو ان دو رکعتوں کے ساتھ نماز ختم ہو جاتی ہے، اس کے اختتام کے لیے دائیں اور بائیں تحیات و سلامتی کے کلمات ادا کیے جاتے ہیں۔ اگر فجر کے علاوہ کسی اور نماز کا موقع ہو تو دوسری رکعت کے بعد نمازی حضرات تیسری رکعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نمازِ مغرب تیسری رکعت پر ختم ہوتی ہے یعنی بیٹھ کر شہادت، صلواۃ اور سلام کے بعد۔ باقی تین نمازوں کی چار رکعتیں ہوتی ہیں ان کی مثال یوں ہے کہ گویا ان میں نمازِ فجر دو مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔

نماز کے جس حصے میں سیدھے کھڑے رہتے ہیں اس میں مسلمان فاتحہ پڑھتے ہیں جو قرآن کی پہلی سورت ہے۔ اس کی سات مختصر آیات ہیں۔ پہلی دو رکعات میں فاتحہ کے علاوہ قرآن کی کوئی دوسری سورت یا کسی سورت کی چند آیات بھی پڑھتے ہیں۔

نماز ادا کرنے کے لیے شرعی طہارت (ritual purity) ہونا ضروری ہے۔ باعمل مسلمانوں کے لیے طہارت ایک معمول کی چیز ہے کیونکہ اس کا تعلق بدن اور لباس کو خون اور بول و براز سے آلودہ ہونے سے بچانے سے ہے۔ مسلمانوں کے لیے آدابِ طہارت کا تعین طہارتِ شرعی کے قاعدے قانون سے ہوتا ہے۔ بچوں سے اگر چہ بلوغت سے پہلے نماز ادا کرنے کا تقاضا نہیں ہوتا تاہم اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کی تربیت چھوٹے بچوں کو بھی اس انداز میں دی جاتی ہے جو انہیں شرعی طہارت فراہم کر دے۔ صفائی کا یہ عمل بنیادی طور پر اس بات پر مشتمل ہے کہ بدن سے خارج ہونے والی تمام نجاست کو احتیاط سے بدن پر سے صاف کر دیا جائے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ صفائی پانی سے کی جائے۔

نجاست (impurity) کی دو بڑی قسمیں ہیں اور اس کے دور کرنے کے لیے طہارت کے دو بنیادی طریقے ہیں، غسل اور وضو۔ غسل کی ضرورت جنسی اختلاط یا مادۂ تولید کے اخراج، حیض، استحاضہ اور میت کے چھونے کے بعد پڑتی ہے۔ جس شخص کے لیے غسل major ablution ضروری ہو وہ نماز ادا نہیں کر سکتا اور اسے مسجد میں داخل ہونے یا قرآنِ مجید کو چھونے سے اجتناب کرنا ہوتا ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے ہلکی نجاست سے بھی پاک ہونا ضروری ہے۔ نجاستِ خفیفہ (minor impurity) سونے، بیت الخلاء جانے، ریاح خارج کرنے

اور دیگر کچھ اور وجوہات سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے دور کرنے کے لیے وضو (minor ablution) ضروری ہے۔

غسل کے لیے سر سے لے کر ایڑی تک سارے بدن کو دھویا جاتا ہے۔ اس طرح کہ کوئی حصہ خشک نہ رہے۔ وضو کے لیے بدن کے کچھ حصوں کو تر کرنے یا دھونے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہے: پہلے ہاتھ، پھر منہ اور ناک، پھر دایاں بازو کہنی تک اور پھر بایاں بازو، سر، کان اور آخر میں دایاں نیز بایاں پاؤں۔ پانی اگر میسر نہ ہو یا بیماری یا کسی دوسری وجہ سے پانی چھونا ممکن نہ ہو اور نماز کا وقت آ جائے تو پھر وضو یا طہارت کی ایک سادہ شکل اختیار کی جاتی ہے جو صاف ریت یا پتھر کے استعمال سے انجام دی جاتی ہے۔ اسے تیمّم کہتے ہیں۔ وضو اور غسل ہر دو کی جگہ تیمّم کیا جا سکتا ہے۔

تمام بالغ مسلمانوں پر نماز دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ وہ خواتین جو حیض میں ہوں یا بچے کی پیدائش کے بعد استحاضے سے گزر رہی ہوں وہ نماز ادا نہیں کرتیں۔ اگر کوئی شخص بہت ہی بیمار ہو جائے تو اس پر نماز معاف ہے ہاں اگر اس میں اتنی سکت ہے کہ لیٹ کر یا بیٹھ کر نماز پڑھ سکے تو اسے نماز ادا کرنا چاہیے۔

نماز ادا کرنے کے لیے جس طرح وضو یا غسل کے ذریعے بدن کی پاکیزگی ضروری ہے اسی طرح لباس اور جائے نماز بھی پاک ہونا چاہیے۔ کپڑے اگر انسانی یا حیوانی فضلے، پیشاب، منی اور خون سے آلودہ نہ ہوں تو ان کو پاک مانا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کی سنت کی پیروی میں مسلمان مرد پیشاب کی حاجت بیٹھ کر رفع کرتے ہیں تاکہ بدن اور لباس پر چھینٹ نہ پڑے۔ اگر لباس ناپاک ہو جائے تو اسے نماز کے لیے استعمال کرنے سے پہلے دھو کر نچوڑ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح نماز پڑھنے کی جگہ بھی پاک رکھی جاتی ہے۔مسلمان عام طور پر اپنے گھر پاک صاف رکھتے ہیں اس لیے (مشرق بعید کے لوگوں کی طرح) وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے جوتے اتار دیتے ہیں۔وہ گھر میں آزادی سے ہر پاک جگہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔گھر میں یا بیرونِ خانہ اگر کسی جگہ کے پاک ہونے میں شبہ ہو یا وہ جگہ پاک نہ ہو تو اس پر کپڑے کا ٹکڑا یا نماز کا غالیچہ یا جائے نماز بچھالی جاتی ہے۔نماز ختم کر کے اسے تہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ایسے کپڑے یا غالیچے کو ''سجادہ'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے ''بکثرت سجدہ کرنے کی جگہ''۔

عالم طبیعی کو از روئے تعریف پاک گردانا جاتا ہے، مسلم ممالک میں آپ کو سڑک کے کنارے کھیتوں میں نماز پڑھتے ہوئے لوگ عام نظر آتے ہیں۔ناپاک کپڑے یا قالین کو پاک کرنے کا عام طریقہ تو دھونا ہی ہے تاہم اگر نجس چیز کو صاف کر دیا گیا ہو تو ایسے کپڑے یا قالین کو دو تین دن تک دھوپ میں رکھنا بھی اسے پاک کر دیتا ہے۔

نماز کو جماعت سے پڑھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔آنحضرتؐ کے فرمان کے مطابق جماعت کی نماز کا تنہا نماز کے مقابلے میں ستر گنا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ جماعت کی تعریف یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ لوگ مل کر نماز ادا کریں۔چنانچہ میاں بیوی یا ماں بچہ مل کر جماعت کر سکتے ہیں۔تاہم جماعت جتنی بڑی ہو اتنی ہی بہتر سمجھی جاتی ہے۔یہ چیز اسلامی عبادات کے سماجی پہلو کے عین مطابق بھی ہے۔

اسلامی معاشرے میں اس جگہ کو ''مسجد'' کا نام دیا گیا ہے جہاں جماعت سے نماز ادا کی جاتی ہے۔مسجد کے لفظ کے معنی ہیں ''سجدہ کرنے کی جگہ''۔عبادت کے اس مشترکہ مرکز کو ''سجدہ گاہ'' اس لیے کہتے ہیں کہ سجدے کو نماز کا عروج جانا گیا

ہے۔ یہ اللہ کے حضور بندے کی غلبت تسلیم، اطاعت اور سرافگندگی کی علامت ہے۔

مردوں کے لیے ہفتے میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز باجماعت کے لیے مسجد جانا لازمی ہے۔ یہ نماز جمعہ کے دن ظہر کی نماز کی جگہ ادا کی جاتی ہے۔ عورتوں پر اس کی پابندی نہیں ہے۔ اہلِ تشیع کے ہاں جمعہ کی نماز واجب نہیں مانی جاتی۔ وہ اسے مندوب کہتے ہیں۔

ایک روایتی اسلامی معاشرے میں زندگی کرنے کا انداز پانچ یومیہ نمازوں سے متعین ہوتا ہے۔ آج بھی کسی اسلامی شہر میں جایئے تو اس لحن اور آہنگ کا احساس اذان سے ہوتا ہے جو ہر مسجد سے اہلِ ایمان کو نماز کے لیے بلانے کے لیے بلند ہوتی ہے۔ اذان کا پہلا فقرہ چار مرتبہ اور آخری فقرہ ایک مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔ باقی ساری اذان دو مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔

اللہ سب سے بڑا ہے

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں

لپکو نماز کی طرف

لپکو فلاح کی طرف

اللہ سب سے بڑا ہے

اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں

صبح کی اذان میں ’’نماز نیند سے بہتر ہے‘‘ کا فقرہ ’’لپکو فلاح کی طرف‘‘ کے بعد بڑھا دیا جاتا ہے۔

اذان دینے والے یعنی مؤذن کا انتخاب خوش آواز اور بلند آہنگ ہونے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ روایتی شہروں میں بہت سی مسجدیں ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے ان کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہوتا چنانچہ اذان کے وقت خوش الحان آوازوں کا ایک سازینہ گونج اٹھتا ہے، ہر آواز ایک دوسرے سے قدرے مختلف لے اور آہنگ میں اذان پکارتی ہے۔ صبح کی اذان کے وقت یہ سماں اور بھی دلآویز اور اثر انگیز ہوتا ہے کہ اذانِ سحر کے سوا سارا شہر خاموشی میں ڈوبا رہتا ہے۔

اب تو معاملہ یہ ہے کہ مسجدوں کے کرتا دھرتا حضرات کی اکثریت حس تناسب اور احساسِ جمال سے عاری ہوتی جا رہی ہے۔ آج مسجدوں کے مینار سے خوش نوا آوازوں کی نوبہ نو صدائیں کان میں نہیں پڑتیں۔ لاؤڈ سپیکر کا شور اٹھتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ہر مسجد سے ایک ہی مؤذن کی ریکارڈ کی ہوئی آواز نشر کر دی جاتی ہے۔ مؤذن کیسا ہی خوش الحان کیوں نہ ہو لاؤڈ سپیکر کے کارن حسنِ آواز کے بہترین نمونے بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ اذان ایک الیکٹرونک مجبوری کی طرح ہم پر تھوپ دی جاتی ہے۔ جو مسافروں کے لیے بھی خاصی بدمزگی کا باعث بنتی ہے اور ان مقامی لوگوں کے حسنِ سماعت پر بھی گراں گزرتی ہے جو ابھی ذوقِ سماعت سے محروم نہیں ہوئے۔

مسلمان کی زندگی میں نماز کی اہمیت کے بارے میں کہنے کو بہت کچھ ہے

یہاں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ نماز کی پابندی سے انفرادی اور اجتماعی نفسیات پر ایک گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔وہ معاشرہ جس میں لوگوں کی اکثریت دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے سامنے حاضر ہوتی ہو اس کا روپ رنگ ایسے معاشرے سے قطعی مختلف ہوتا ہے جس کے لوگوں کی زندگی میں خدا کا کوئی حصہ نہ ہو، ان کے پاس خدا کے لیے وقت نہ ہو یا جس معاشرے میں مذہب ایک نجی، ذاتی معاملہ ہو یا دینی معاملات کے لیے ہفتے میں صرف ایک دن رکھا گیا ہو۔حدیثِ ذیل میں نماز کے اثرات کو نہایت ایجاز سے بیان کیا گیا ہے۔

رسولِ خدا نے فرمایا ''اگر کسی کے گھر کے سامنے دریا بہتا ہو اور وہ دن میں پانچ مرتبہ اس میں نہائے تو بتاؤ کہ کیا اس کی کوئی گندگی باقی رہ جائے گی''؟ لوگوں نے جواب دیا ''اس کی کوئی کثافت باقی نہ رہے گی'' آپ نے فرمایا، ''پانچ نمازوں کی مثال یہی ہے۔اللہ تعالی گناہوں کو ان نمازوں سے دھوڈالتا ہے''[۲۵]

تیسرا رکن۔زکات

زکات انسان کے مال یا منافع میں سے ایک مخصوص فیصدی حصہ ہر سال محتاجوں کو ادا کرنے کا نام ہے۔قرآن کے مطابق (۹:۶۰) آٹھ طبقوں کو زکات دی جاسکتی ہے۔فقراء، مساکین، عاملینِ زکات، جن کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو ان کی تالیفِ قلوب کی خاطر، قیدی، مقروض، راہِ خدا کے مجاہدین اور مسافر۔زکات وصول کرنے کے قوانین و احکامات خاصے مفصل ہیں۔آپ کے اموال کی نوعیت کیا ہے اور اس کے حصول کی شرائط کیا ہیں ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زکواۃ کی شرح اڑھائی فیصد سے دس فیصد تک ہوسکتی ہے۔زکات کے لفظ کے اصلی معنی ''پاک کرنے'' کے ہیں۔زکواۃ میں یہ تصور مضمر ہے کہ لوگ اپنی دولت کا کچھ حصہ

اللہ کی نذر کریں اور یوں ان کا مال پاک ہو جائے۔وضو بدن کو پاک کرتا ہے،نماز نفسِ انسانی کو پاکیزگی عطا کرتی ہے۔اسی طرح زکات ہمارے اموال و املاک کو پاک کرکے اسے اللہ کے لیے پسندیدہ بنا دیتی ہے۔

زکات معاشرے سے متعلق ایک چیز ہے۔اس کی سماجی اہمیت واضح ہے۔ انفرادی احوال کا تزکیہ تبھی ہوتا ہے جب اس سے ایک فرد دوسروں کے کام آتا ہے۔زکات ادا کرنا ہو تو گرد و پیش میں بسنے والے دوسرے لوگوں کی خبر رکھنی پڑتی ہے اور محتاجوں ضرورتمندوں کی تلاش کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔زکات ہی کی طرح نماز کی بھی ایک سماجی معنویت ہے لیکن نماز کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔دوسرے کے ساتھ مل کر پڑھنا لازم نہیں۔اس کے برعکس زکات کا دارومدار سراسر سماجی لین دین پر ہے۔کوئی فرد اپنے آپ کو تو زکات ادا نہیں کرسکتا۔

زکات ادا کرنے کا انحصار صرف زکات کے مستحق لوگوں کے حالات پر ہی نہیں ہوتا اس کا تعلق زکات دینے والے کے حالات سے بھی ہے۔بہ الفاظِ دیگر زکات اسی وقت ادا ہو گی جب اس کی شرائط پوری ہوں گی۔صاحبِ نصاب کے پاس مال ہو گا،منافع ہو گا تبھی زکات ادا کی جائے گی۔یہ شرائط پوری نہ ہوں تو زکات ادا نہیں ہو گی۔اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر انفاق اور صدقہ کرنا یقیناً تعریف کی بات ہے لیکن یہ زکات نہیں کہلائے گی کہ اس کے لیے شریعت کی بتائی ہوئی شرائط پوری نہیں ہوئیں۔

زکات پر اس لحاظ سے نظر کیجیے تو اس بات کی مثال سامنے آتی ہے کہ اسلام اپنی ترجیحات کس طرح قائم کرتا ہے۔کچھ چیزیں مطلقاً لازم ہیں جیسے کلمۂ شہادت اور نماز۔دیگر امور حالات پر منحصر ہیں جیسے زکات۔غور کیجیے تو واضح ہو گا کہ لازمی اور

واجب امور کا تعلق فرد سے ہے کہ ہر طرح کی حالات میں ایک ہستی، ایک فرد تو بہر حال موجود رہتا ہے جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہے۔ جو امور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ان کا تعلق معاشرے سے ہے۔ کیونکہ یہ لازم تو نہیں ہے کہ ہر شخص ایک خاص سماجی ماحول کا حصہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ پہلے ہم اپنے آپ کو درست کریں۔ یہ کر چکیں تو پھر معاشرے کے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے کی نوبت آئے گی اور وہ بھی اللہ کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں۔

مختصر یہ کہ اللہ سے سچا تعلق قائم کرنا ہمارے لیے اولیت رکھتا ہے۔ اور اس کا آغاز فرد کی ذات سے ہوتا ہے۔ صحت مند معاشرہ تبھی جنم لے گا جب اس کے افراد تندرست ہوں گے۔ معاشرے کی تعمیر افراد سے ہوتی ہے اس لیے اسلام فرد پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ تاہم اگر فرد کو مذہب کے پیمانے پر پورا اترنا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک سماجی ذمہ داری بھی قبول کرے۔ حضورؐ نے یک موقع پر فرمایا تھا کہ ''نکاح نصف دین کے برابر ہے'' اس میں یہی اشارہ ہے کہ خاندان وہ خشتِ اوّل ہے جو معاشرے کی تعمیر کے لیے رکھی جاتی ہے۔ خاندان کی صحت کی شرط یہ ہے کہ افرادِ خانہ صحت مند ہوں اور اگر خاندان کی صحت اچھی ہو گی تو معاشرے کی صحت اچھی رہے گی۔

رکن چہارم: روزہ

دین کا چوتھا رکن یہ ہے کہ ''رمضان کے مہینے میں روزہ رکھا جائے''۔ رمضان اسلامی تقویم کا نواں مہینہ ہے۔ اسلامی سال قمری تقویم کے مطابق چلتا ہے۔ اس میں ۳۵۵ دن ہوتے ہیں۔ ہر ماہ کے ۲۸ یا ۳۰ دن ہوتے ہیں۔ مہینہ ۲۹ کا ہو گا یا ۳۰ کا اس بات کا فیصلہ چاند ''دیکھنے'' سے کیا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات واضح ہو گی کہ

ہمارے ہاں روز وشب کا آغاز غروبِ آفتاب سے کیوں کیا جاتا ہے۔ افقِ مغرب پر نیا چاند غروبِ آفتاب کی ساعت میں نظر آتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے۔ اگر مطلع ابر آلود ہو اور لوگوں کو ماہِ نو کے آغاز کے لیے دنوں کا حساب کرنا پڑے تو گزرے ہوئے مہینے کو ۳۰ دن کا شمار کیا جاتا ہے۔

رمضان کا آغاز اس روز سے ہوتا ہے جب چاند دیکھا جائے یا پھر گذشتہ مہینے کے تیس دن پورے ہو جائیں۔ روزے کا آغاز اگلی صبح طلوع سے پہلے ہوتا ہے۔ طلوعِ سحر کی تعریف یہ ہے کہ افقِ مشرق پر اجالے کے آثار ظاہر ہو جائیں یا قدرتی روشنی میں آپ سفید اور سیاہ ڈوری میں امتیاز کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ اذانِ صبح کا وقت ہوتا ہے یعنی افق سے آفتاب ابھرنے سے لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ قبل۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی روزے کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے یعنی اذانِ مغرب کے ساتھ روزہ کھل جاتا ہے۔

کھانے پینے سے گریز، تمباکو نوشی سے اجتناب اور جنسی عمل سے الگ رہنے کا نام روزہ ہے۔ بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے ہر مسلمان پر روزہ فرض ہے۔ روزہ نہ رکھنے کے کئی جائز، قابلِ قبول عذر ہو سکتے ہیں جیسے بیماری اور سفر۔ حاملہ خواتین اس رخصت سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ ایامِ حیض میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ جو روزے چھوٹ جائیں ان کے لیے بعد میں کسی بھی وقت قضا روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیے روزہ دار کوئی بھی دن چن سکتا ہے۔

رمضان وہ زمانہ ہے جب خوش اطواری اور حسنِ عمل کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آنحضرتؐ نے فرمایا، ''روزہ دار کا روزہ پانچ چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، جھوٹی قسمیں کھانا اور بد نظری''۔ بالفاظِ دیگر ایک

ایسے وقت میں جب کچھ جائز کام بھی ممنوع ہو چکے ہوں ایسے اعمال روزہ دار کا روزہ غارت کر دیتے ہیں جن کی عام دنوں میں بھی ہمیشہ مناہی کی گئی ہو۔

رمضان ایک قمری مہینہ ہے۔اس حوالے سے چند دلچسپ امور کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔خزاں اور بہار کے ان دنوں کے سوا جب شب و روز کے گھنٹے برابر ہوتے ہیں، روئے زمین پر مختلف مقامات پر سال کے مختلف ایام میں دن کی لمبائی الگ الگ ہوتی ہے۔جون میں دن کی روشنی شمالی نصف کرۂ ارض میں دیر تک رہتی ہے۔اس کے مقابلے میں جنوبی کرۂ ارض میں دن چھوٹا ہوتا ہے۔اب آپ دیکھیے کہ کیا کوئی شمسی مہینہ ایسا ہوسکتا ہے جس میں دنیا میں ہر جگہ کے مسلمان ایک ہی جتنا لمبا روزہ رکھیں؟ یہاں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی شمسی تقویم (کیلنڈر) یوں چلتی تھی کہ قمری کیلنڈر میں ہر تین سال بعد ایک مہینہ بڑھا دیا جاتا تھا ویسے ہی جیسے یہودی کیلنڈر میں آج بھی کیا جاتا ہے۔لیکن اگر آپ قمری مہینوں کے حساب سے روزہ رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا تمام مسلمان جو تینتیس سال تک روزے رکھتے رہے ہوں ان کے روزہ رکھنے کی مجموعی مدت بالکل یکساں ہوگی خواہ وہ کسی بھی جگہ کے رہنے والے ہوں قمری سال کی وجہ سے رمضان ہر شمسی سال میں لگ بھگ گیارہ دن آگے بڑھ جاتا ہے۔چنانچہ ۱۹۹۸ء سال عیسوی میں اگر یکم رمضان بیس دسمبر کو واقع ہوا تو اگلے سال ۱۹۹۹ء میں پہلا روزہ نو دسمبر کو پڑے گا اور سن دو ہزار میں نومبر کی ۲۸ تاریخ کو۔اسی طرح آئندہ کا حساب کیا جا سکتا ہے۔دنیا کے شمالی عرض بلد کے باسیوں کو دسمبر میں اگر آٹھ نو گھنٹے کا روزہ رکھنا ہوتا ہے تو انہی لوگوں کو آج سے ۱۷ سال بعد جب رمضان جون میں آئے گا، سترہ یا اٹھارہ گھنٹے کا روزہ رکھنا ہوگا۔بنابریں اکثر مسلمانوں کی زندگی رمضان سے متعین

ہونے والے ادوار میں سے گزرتی رہتی ہے جس میں پہلے تو رمضان کا زمانہ آسانی سے گزرتا ہے اور پھر روزے مشکل ہوتے جاتے ہیں۔

دین کے دوسرے ارکان کی طرح روزے کی بھی ایک مضبوط سماجی جہت ہے اور اس کے اثرات پورے معاشرے میں پھیلتے ہیں۔ جب فرد کی زندگی کا بنیادی ڈھنگ بدلتا ہے تو معاشرے میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ جہاں کہیں بھی مسلمان روایتی انداز میں زندگی بسر کرتے ہوں وہاں کھانے پینے کی دکانیں رمضان میں دن کے اوقات میں بند رہتی ہیں۔ لوگ عموماً روزہ شروع ہونے سے پہلے صبح سویرے سیر ہو کر کھا لیتے ہیں۔ موسم کی رعایت سے اور اپنے اپنے رہن سہن کے مطابق اس کے بعد لوگ یا تو جاگتے رہتے ہیں یا نمازِ صبح سے فارغ ہو کر دوبارہ سو رہتے ہیں۔ اس کے بعد دن بھر لوگ اپنی سرگرمیاں معمول کے مطابق انجام دیتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو رمضان کے روزے کا کوئی تجربہ نہ ہو وہ شاید یوں سوچ لیں کہ ناشتہ نہ ملا یا دوپہر کا کھانا نہ کھایا تو کیا بگڑے گا لیکن آنکھ کھلتے ساتھ کافی کی طلب کا کیا ہوگا؟ گہری نیند سے جاگنے کے بعد پانی کا گھونٹ بھی بہت کچھ ہوتا ہے کہ اس سے جسم کا نظام حرکت میں آتا ہے۔ موسمِ سرما میں آٹھ گھنٹے کھائے پیئے بنا رہنا کچھ ایسا مشکل نہیں لیکن ذرا جون اور جولائی کے روزے کے بارے میں سوچیے۔ پھر یہ کہ ایک دن، دو دن تو شاید آسانی سے گزر جائیں مگر ہفتہ، دو ہفتہ یہ سلسلہ کیونکہ چلے گا؟ اگر انسان کا ایمان پختہ نہ ہو تو پورے مہینے کے مسلسل روزے رکھنا، گرمی یا سردی میں، ایک ایسا کام ہے جسے نبھا جانا ممکن نہیں۔

رمضان کے روزے دشوار ہونے کا ذکر چلا ہے تو ہم یہ کہتے جائیں کہ اس کا مطلب یہ نہ جانیے کہ مسلمان اسے سختی کا زمانہ گردانتے ہیں۔ ان کے لیے تو عموماً

رمضان سال کا سب سے پرمسرت زمانہ ہوتا ہے۔گو رات ہونے تک اس کا احساس اُجاگر نہیں ہوتا۔دن کے اوقات میں لوگ اس خوشی کے ظاہر کرنے میں ذرا دبے رہتے ہیں۔روایتی اسلامی شہر رمضان کے دنوں میں دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں، رات اور دن میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ آپ اسے ایک دوسرے کا الٹ کہہ سکتے ہیں۔ رات کے مقابلے میں دن میں چہل پہل کم ہوتی ہے بہت سی دکانیں بند رہتی ہیں اور لوگ باگ اکل کھرے نہ بھی ہوں تو بھی خاموشی کی طرف مائل رہتے ہیں۔لیکن ادھر اذان کی آواز بلند ہوئی یا افطاری کا دھونسہ بجا ادھر ساری فضا ہی بدل جاتی ہے۔ روزہ کھلنے کا سبھی کو بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ نبی علیہ السلام کے طریقے کے مطابق دو ایک کھجوریں کھا کر یا پانی کے گھونٹ سے روزہ افطار کیا جاتا ہے اور پھر سب لوگ نمازِ مغرب ادا کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔بازاروں،قہوہ خانوں اور کھانے پینے کی دکانوں میں سورج ڈوبنے سے پہلے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے جو کھانے پینے کی چیزیں سامنے رکھے بڑے صبر سے بیٹھے رہتے ہیں۔عالمِ اسلام کے بہت سے علاقوں میں تو ایک رواج سا ہو گیا ہے کہ روزہ کھلنے کے بعد خورد نوش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔رمضان کی راتیں تو چھوٹے موٹے جشن کا سماں پیش کرتی ہیں اور رات ہوتے ہی گلی کوچوں میں زندگی کی وہ گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے جو سال کے دوسرے مہینوں میں صرف دن کے اوقات میں نظر آتی ہے۔

اسلام کے شرعی قانون کے مطابق روزہ نہ رکھنا بڑا گناہ ہے۔ایک دن کا روزہ جان بوجھ کر چھوڑ دینے کی پاداش میں دو ماہ کے روزے رکھنا ہوتے ہیں۔تاہم، دیگر معاملات کی طرح، اس ضابطے کو نافذ کرنے کا بھی کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے۔انسان اس معاملے میں صرف اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہے، روایتی

اسلامی معاشرے میں ہر شخص روزے کی پابندی کا دھیان رکھتا تھا۔تنہائی میں البتہ لوگوں کو ہر طرح کی آزادی ہوتی تھی۔اللہ کے سوا انہیں دیکھنے والا اور کون تھا!

آج عالمِ اسلام کے بڑے شہروں کو جا کر دیکھیے تو یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید معدودے چند لوگ ہی روزہ رکھتے ہوں گے۔ریستوران اور کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی اور زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں۔لیکن ایسا ہے نہیں۔وہ مسلمان جو مغرب میں جا بسے ہیں اور ارکان اسلام کے پابند نہیں رہے ان میں بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ دو ایک دن کے روزے رکھ لیتے ہیں۔(عیسائیوں میں بھی جو بچا کھچا دین رہ گیا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے مسیحی لوگ سال میں ایک مرتبہ ایسٹر کے موقع پر گرجا جاتے نظر آجاتے ہیں)۔روزہ داری کے اس علامتی یا جزوی عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روزہ وہ عبادت ہے جو سراسر بندے اور اس کے رب کا معاملہ ہے۔اس کے سماجی پہلو اپنی جگہ ہیں لیکن روزہ رکھنے یا روزہ توڑنے اور چھوڑنے کا علم صرف خدا ہی کو ہوسکتا ہے۔اسی لیے تو رمضان کے روزے کو عموماً ارکان اسلام میں سب سے زیادہ ذاتی اور روحانی عمل سمجھا جاتا ہے۔نماز دوسروں کی نظر میں آجاتی ہے اور معاشرتی نظام کے گتھے ہوئے رشتہ وپیوند کے کارن ہر شخص کو دوسرے کے بارے میں پتہ ہوتا ہے کہ اس کی نماز ادا کرنے کی کیفیت کیا ہے۔لیکن اس بات کی نگرانی کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ آپ نے دن بھر میں کب چھپ کر پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتار لیے یا کھانے کی کسی چیز سے بھوک کو بہلا لیا۔بہتیرے بے عمل لوگ یہی سوچ کر دو ایک دن کا روزہ رکھ لیتے ہیں کہ اپنے آپ کو اور اللہ تعالیٰ کو یہ تو جتا دیں کہ انہوں نے اسلام کو بالکل چھوڑ نہیں دیا۔

رکن پنجم ۔ حج

اسلام کا پانچواں رکن ’’بیت اللہ کا حج ہے اگر آپ اس کی استطاعت رکھتے ہوں ۔‘‘ حج عبادات اور مناسک کا ایک سلسلہ ہے جو ہر سال مکہ اور اس کے گردو نواح میں انجام دیا جاتا ہے۔اس کا آغاز قمری سال کے آخری مہینے ذوالحجہ (حج والا مہینہ) کی آٹھ تاریخ سے ہوتا ہے اور اختتام اسی ماہ کی تیرہ تاریخ کو ہوتا ہے۔ اسلام سے بہت پہلے مکہ کو ایک مقدس مقام کی حیثیت حاصل تھی ۔مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت آدمؑ نے مکہ میں بھی ایک عبادت گاہ تعمیر کی تھی جس کی تعمیرِ نو بالآخر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ہوئی ۔ظہورِ اسلام سے کہیں پہلے عرب قبائل کے لیے کعبہ ایک زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔قرآنِ مجید اور پیغمبر اسلامؐ نے کعبے کے گرد سرانجام پانے والی عبادات میں ترمیم وتبدیلی کی اور ان کو پھر سے ایک تقدیس عطا کر کے ارکانِ دین کا مرتبہ دے دیا۔

مسلمانوں پر زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے لیکن اس صورت میں جب ان کے پاس اس کے لیے وسائل موجود ہوں ۔حج کی معنویت جاننے کے لیے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہوائی جہاز ، دخانی بحری جہاز اور بسیں وغیرہ ادھر سو سال سے استعمال میں آئے ہیں۔تیرہ سو سال تک مسلمانوں کی اکثریت یا پیادہ یا گھوڑے اونٹ پر سوار ہو کر حج کرنے جاتے تھے۔اس زمانے میں یہ اتنا آسان نہیں تھا کہ آپ دو ہفتے کی چھٹی لے کر سفر پر روانہ ہوں اور آئندہ سوموار کو لوٹ کر دفتر حاضر ہو جائیں ۔اس کے برعکس اکثر مسلمانوں کے لیے حج ایک دشوار گزار سفر تھا جو کئی ماہ پر پھیلا ہوا تھا اور بسا اوقات سال دو سال بھی لگ جاتے تھے۔ پھر جب سفر پر نکل کھڑے ہوتے تو واپسی کی عجلت کیسے ہوگی؟ لوگ مکہ یا مدینہ میں

چند ماہ ٹھہرتے، سفر کی کوفت دور کرتے، واپسی کے سفر کی تیاری کرتے، دنیا بھر سے آئے ہوئے دوسرے مسلمانوں سے میل ملاقات رہتی اور حصولِ علم کے مواقع فراہم ہوتے۔ اکثر یہ قیام سالوں پر محیط ہو جاتا تھا، کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ لوگ اسی شہر میں اپنے دمِ واپسیں کے منتظر رہتے تھے خواہ اس کا بلاوا کتنی ہی دیر میں کیوں نہ آئے۔

آج سفرِ مکہ چند گھنٹوں کی بات ہے، کہیں سے کیوں نہ ہو۔ کچھ لوگ امسال حج کے لیے عزمِ سفر اس لیے کریں گے کہ سال گذشتہ برمودا ہو آئے تھے۔ ماضی میں اکثر مسلمانوں کو اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کڑی شرائط پر پورا اترنا ہوتا تھا۔ بلکہ یوں جانیے کہ وہ موت کا سامنا کرنے کی تیاری کر کے نکلتے تھے۔ وہ ایک طرح سے طے کر لیتے تھے کہ اب اس سفر سے واپسی نہیں ہونا ہے اور اس کے لیے ہر ضروری سامان کر کے ہی آغازِ سفر کیا جاتا تھا۔ حج کے سفر کی ایک شرط یہ تھی کہ آپ نے اپنے ذمہ ہر قرض ادا کر دیا ہو۔ ایک شخص حج کا ارادہ کیے ہو اور اس کی بیوی اس کی ہمسفر نہ ہو سکے تو اس پر لازم تھا کہ وہ اس کے رہن سہن اور خرچ کا انتظام اسی طرح کر کے جائے جیسا اپنی موجودگی میں کیا کرتا تھا۔ حاجی پر اپنے آل اولاد کی فکر بھی لازم تھی اور ان سب لوگوں کی بھی جن کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر رہی ہو۔

روایتی طور پر حج راہِ خدا میں قدم رکھنے کی ایک مہتم بالشان عبادت سمجھی جاتی ہے، دنیا کے الجھیڑوں سے نکل کر خدا طلبی، اللہ سے لو لگانے کا عمل۔ حج کرنے کے لیے لوگ ان تمام چیزوں سے اپنے آپ کو یکسر کاٹ دیتے تھے جو ان کو صبح شام الجھائے رکھتی تھیں۔ وہ اپنے رب کی آواز پر لبیک کہنے کی تیاری کرتے جو انہیں بلاتی اور اپنے گھر آنے کی ندا دیتی تھی۔ حج ایک طرح کی موت ہی تھا کہ قرآن میں

موت کو بار بار اللہ کا سامنا کرنے، اس سے ملاقات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور کعبہ خدا کا گھر ہے۔ خلاصہ یہ کہ حج ایک طرح سے موت اور خدا سے جا ملنے ہی کے مترادف تھا۔ اس طرح حج سے واپسی گویا نیا جنم لینا ٹھہرا۔ اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ سارے عالم اسلام میں حاجی کا لقب اتنا محترم کیوں گردانا جاتا ہے۔ حاجی کو ایسا شخص سمجھا جاتا ہے جو دنیائے دوں کی غلامی سے آزاد ہو چکا ہو۔ اسے تقویٰ اور روحانیت کا نمونہ جانا جاتا تھا اور بلاشبہ ان میں سے اکثریت اپنے لقب پر پوری اترتی تھی اور معاشرے میں وہی مثالی کردار اور ذمہ داری انجام دیتی تھی جو اس نام کا تقاضا ہے۔ معدودے چند لوگ ایسے بھی رہے ہوں گے جو اس نام سے ملنے والے عزت و احترام کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوں گے۔

چھٹا رکن؟۔ جہاد و مجاہدہ

بعض علماء کا خیال ہے کہ اسلام کا ایک چھٹا رکن بھی ہے: جہاد۔ انگریزی میں یہ لفظ بہت معروف ہو چلا ہے۔ اس کی وجہ موجودہ سیاسی حالات اور میڈیا کی طرف سے قتل و غارت اور تشدد کی خبروں پر خصوصی توجہ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر بات صرف اسلام میں جہاد کی حیثیت کی ہوتی تو ہمیں اس موضوع پر زیادہ گفتگو کرنے کی کوئی ایسی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس لفظ سے لپٹے ہوئے تصورات کے کارن ہم قدرے تفصیل سے اس کا جائزہ لیں گے۔

”جہاد“ کے لفظ یا اصطلاح کے بارے میں پہلی بات تو یہ جان لیجیے کہ اس کے ترجمے کے لیے جو ترکیب انگریزی میں چل نکلی ہے وہ نہایت گمراہ کن ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ holy war کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ تاریخِ اسلام کے حوالے سے دیکھیے تو ہر وہ جنگ جو ”ہم“ کرتے آئے ہیں اسے جہاد کا عنوان دیا گیا

ہے۔مغرب میں بھی ابھی کچھ زمانہ پہلے تک یہی صورتحال تھی ۔ ہر لڑائی کو مقدس holy war کہا جاتا تھا اس لیے کہ (بزعم خود) اللہ کی حمایت ہمارے ساتھ ہوتی تھی ۔یہ اصطلاح استعمال کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جنگ کا دوسرا فریق دشمنِ خدا کی درجے پر گرادیا جاتا تھا۔خلاصہ یہ کہ اس لفظ کو ہر جگہ ایک قومی نعرے کے طور پر برتا گیا۔آج کی اصطلاح میں اس نعرے کو بدل کر کہیے تو جہاد کرنے کا مطلب ہے ''جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کی جنگ''۔یہ بھلے لوگوں کے کرنے کا کام ہے۔

قرآن میں اس لفظ کو جس طرح برتا گیا وہ سیاسی معانی سے کہیں وسیع ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''جہدو جہد،کوشش''۔عام طور پر یہ لفظ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں اس کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' (اللہ کی راہ میں) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ''اللہ کا راستہ''یقیناً صحیح راہِ عمل ہے جس کا تعین قرآن سے اور نبی علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ سے ہوتا ہے۔

ایک طرح سے دیکھیے تو جہاد کی حیثیت فقط اسلام کے تکمیلی عنصر کی ہے۔ اسلام کا لفظ مآل کار''اطاعت وفرمانبرداری اور تسلیم وسرافگندگی''ہی کے معنی رکھتا ہے۔مغرب والے اسے ایک طرح کی انفعالی کیفیت سمجھتے ہیں۔لیکن یاد رہے کہ یہ تسلیم وقبولیت اللہ کی مشیت اور اس کے حکم کی ہے اور اللہ کی مرضی یہی ہے کہ لوگ اس کی راہ میں جہدو جہد کریں۔سو یہ جہدوجہد از خود تقاضائے اسلام بن جاتی ہے۔حکمِ خداوندی کی قبولیت لوگوں سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر اور معاشرے میں پھیلے ہوئے تمام منفی رجحانات کے خلاف سرگرم رہیں جو انہیں خدا سے دور کرنے کا امکان رکھتی ہیں۔اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو تسلیم وسرافگندگی اور راہِ حق میں جہدو جہد ایک دوسرے سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں اور ایک سے

دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔

اسلام کے سیاق وسباق میں دیکھیے تو یہ ایک بدیہی سے بات ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا تقاضا اس کی راہ میں کوشش اور محنت بھی ہے۔نماز، زکواۃ، روزہ اور حج سبھی اعمال جہد وجہد مانگتے ہیں۔اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ سب کام آسان ہیں تو ذرا آداب وقواعد کی پابندی کے ساتھ چند روز نماز پڑھ کر دیکھیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں سب سے بڑی روک رکاوٹ ان کی اپنی آلکس، سستی اور بے دھیانی ہی بنتی ہے۔لمحہ موجود کی آراء اور واقعات کی رو انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے اور وہ اس کی مزاحمت نہیں کرتے۔ایک ایسے حکم وفرمان کی اطاعت کرنا جو نہ صرف ہماری پسند و ناپسند کے میلانات پر روک لگاتا ہو بلکہ انبوہِ مردم کی نقل کرنے کے معاشرتی دباؤ کی بھی مزاحمت کرتا ہو بہت بڑی کاوش کا تقاضا کرتا ہے۔

اللہ کے ہاں جہاد کی کیا حیثیت ہے اس کا اندازہ کئی امور سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال دیکھیے۔یہ آنحضرتؐ کے الفاظ ہیں۔اللہ کے نئے دین کے دشمنوں سے ایک جنگ کے بعد آپؐ مدینہ واپس لوٹ رہے تھے کہ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا ''ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں''۔اصحاب نے پوچھا، ''اے خدا کے رسولؐ، کفار کے خلاف تلوار لے کر صف آراء ہونے سے بڑا جہاد اور کیا ہوگا''؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد کیا، ''اس دشمن کے خلاف جہاد جو تمہارے سینوں کے اندر ہے''۔[۲۶]

اسلامی تہذیب میں اس موضوع پر جو تحریریں مابعد کے زمانے میں ملتی ہیں ان میں داخل کے اس جہاد، اس باطنی جہاد کو مجاہدے کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ازروئے قواعد مجاہدے کا لفظ جہاد ہی سے نکلا ہے اور دونوں کے معنی بالکل ایک ہی ہیں۔ لیکن جہاد کا لفظ خارجی جنگ یعنی اپنی ذات سے باہر ہونے والی لڑائی اور انسان کے اندرونی منفی میلانات کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد دونوں کے لیے مستعمل رہا ہے جبکہ مجاہدے کا لفظ صرف اور صرف جہادِ اکبر، داخل کے جہاد کے بیان کے لیے خاص ہوگیا ہے۔

وہ مسلمان اہلِ علم جو جہاد کو اسلام کا چھٹا رکن کہتے ہیں ان کے ذہن میں یہی بات ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں کوشش وجدوجہد کرنا مسلمانوں کے لیے ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس چیز کا بھی ادراک رکھتے ہیں کہ یہ جدوجہد بسا اوقات دشمنانِ اسلام کے خلاف خارجی جنگ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔

تاہم یہاں ہم ایک بات پر زور دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اسلامی ممالک کی عام روزمرہ زبان میں جہاد کا لفظ محض جنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ویسے ہی جیسے اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ اگر کسی سے جنگ میں اُلجھ جائے تو امریکیوں کی اکثریت اسے ایک جائز لڑائی سمجھتی ہے۔ دوسری طرف اسلام کے احکامات کا ٹھیٹھ معنوں میں اطلاق کریں تو بہت سے جہاد بس نام کے جہاد نظر آئیں گے۔ کوئی بھی بادشاہ (یا کوئی آمر جیسا کہ ادھر کے زمانے میں دیکھا گیا) اعلانِ جہاد کر سکتا ہے اور اس کو علمائے وقت میں سے کوئی نہ کوئی مل بھی جائے گا جو اس کی حمایت میں بیان دینے پر تیار ہوگا، مثلاً شاہی مسجد میں شاہ کا مقرر کردہ واعظِ شہر و مفتیِ اعظم۔ علماء کی اکثریت بہر حال ایسی رہی ہے جو کسی جنگ کی تائید صرف اس لیے نہیں کر دیتی کہ اس کا اعلان بادشاہِ وقت نے کر دیا ہو۔ ان کی طرف سے صرف اس جہاد کی حمایت

کی جاتی تھی جو اسلام کی تعلیمات و احکامات کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے کیا جائے۔اس پیمانے پر دیکھیے تو شاید یہ کہنا درست ہو گا کہ گذشتہ صدی میں اگر ہوئے بھی تو چند ایک ہی صحیح اور جائز جہاد رہے ہوں گے۔ادھر کے گزرے ہوئے کئی سو سال میں تو شاید کوئی بھی نہ ہو گا۔

شریعت اسلام

دین کے پانچ ارکان اسلام کے بنیادی اعمالِ عبادت ہیں۔ان کا تعلق ہر مسلمان سے ہے۔یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے زندگی بھر زکات دینے کی نوبت نہیں آتی یا وہ حج نہیں کر پاتے کیونکہ ان کے شخصی حالات میں ان کے لیے اس کا امکان نہیں پیدا ہوا۔ہر مسلمان کلمۂ شہادت پڑھ چکا ہوتا ہے کہ کلمہ پڑھ کر ہی تو انسان مسلمان ہوتا ہے۔نماز ہر بالغ مسلمان پر روزانہ فرض ہے اگرچہ اس میں خواتین کے لیے ہر ماہ کچھ دن کا استثناء کیا گیا ہے۔رمضان میں روزہ رکھنا ہر مسلمان کا سالانہ معمول ہے اگرچہ بعض جائز وجوہات کی بناء پر روزہ چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید اور نبی علیہ السلام کے اور بھی بہت سے احکامات ہیں جن کو بجالانا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ان میں سے بہت سے احکامات کا تعلق اخلاقی ضابطوں سے ہے اور یہ اخلاقی ضابطے ایک عالمگیر اطلاق رکھتے ہیں۔ممنوع کاموں (کی فہرست) میں چوری،قتل،زنا اور حرامکاری شامل ہیں۔کچھ دوسرے احکامات ہیں جن کا تعلق ان شعبوں سے ہے جو آج کے جدید مغربی روزمرہ کے مطابق عموماً دین کے دائرہ کار سے بارہ پتھر باہر سمجھے جاتے ہیں مثلاً میراث اور وراثت،شادی بیاہ،کاروباری لین دین اور خوردنی و ناخوردنی غذائیں۔

قرآنِ مجید اور نبی علیہ السلام کے مقرر کردہ احکامات اور ضابطوں کا مجموعہ مرتب ہو کر شریعت کے طور پر سامنے آیا یعنی ''پانی کے گھاٹ تک جانے کا کھلا راستہ''۔ صحیح راہِ عمل جس پر چلنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ یہ پانی وہی آبِ سماوی ہے جو تزکیہ بھی کرتا ہے اور مغفرت و بخشش کا وسیلہ بھی ہے، وہی آبِ زلال جس کا ذکر قرآنِ مجید کی کئی آیات میں آیا ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۸:۱۱)

وہ تم پر آسمان سے پانی برسا دیتا ہے تا کہ اس سے تم کو پاکیزہ کر دے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کر دے۔

شریعت کے لفظ کا ترجمہ عموماً ''اسلامی قانون'' یا ''الہامی قانون'' کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ اسلامی علوم کے اس شعبے کا مطالعہ ''فقہ'' کہلاتا ہے۔ اس شعبۂ علم کے ماہرین کو فقہا کہا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ عملاً تو تمام علمائے اسلام یعنی اسلام کے بارے میں معلومات رکھنے والے لوگ فقہ کا وسیع علم رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ علماء کو دوسرے شعبوں اور علوم میں بھی خصوصی مہارت ہو گی جیسے الٰہیات، فلسفہ یا تصوف۔ ہم پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلامی ممالک میں جن لوگوں کو علماء یا مولوی، ملا کہا جاتا ہے ان کی کثرت کثیرہ اصل میں صرف فقہ کے ماہرین پر مشتمل ہوتی ہے کیونکہ انہیں اسلامی علوم کے دوسرے شعبوں کا یا تو سرے سے علم ہی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو بہت کم۔ مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی پہلی جہت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے لیکن دوسری

اور تیسری جہت کا علم اتنا عام نہیں ہے گو کئی اعتبار سے ان کی اہمیت پہلی جہت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اسلام میں عمل کی اہمیت بنیادی ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ بالکل فطری بات ہے۔ ہر انسان کا ایک بدن ہے اور بدن ہے تو اس کا عمل بھی ہوگا لہٰذا ہر شخص کو عمل کے لیے لائحہ عمل اور اس کے لیے ہدایات کی ضرورت ہوگی۔ ہونے کو تو ہر انسان کا ذہن بھی ہے اور دل بھی مگر انسانوں کی طبیعی ساخت یہ ہے کہ ان کی اکثریت سوچ بچار کی زحمت کم ہی کرتی ہے۔ تزکیۂ قلب کی مشقت اور اصلاحِ نیت کی محنت کر کے خود کو مشاہدۂ خداوندی کے لیے تیار کرنے والے بھی کم ہی نکلتے ہیں۔ تاریخ کے معلومہ ادوار میں تو کم از کم ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ انسانی کاوش کی یہ قلمرو ہمیشہ سے ایک اقلیت سے آباد رہی ہے۔ اس معاملے میں اسلام کو کچھ ایسا استثناء حاصل نہیں ہے۔

Law یا قانون کا لفظ ''شریعت'' کے ترجمے کے لیے کچھ ایسا موزوں یوں بھی نہیں ہے کہ شریعت جن امور سے سروکار رکھتی ہے وہ انگریزی کے لفظ کے مدلولات و مفہوم سے مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھیے کہ قانون کا لفظ انگریزی میں اوامر و نواہی کے لیے خاص سمجھا جاتا ہے مثلاً قانون کا تقاضا ہے کہ آپ ٹیکس ادا کریں اور قانونی ممانعت ہے کہ آپ دوسرے انسانوں کی جان لینے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ ہی انسانی عمل کا ایک تیسرا میدان بھی ہے، وہ امور جن سے قانون کو سروکار نہیں ہے۔

اسلامی فقہ بھی انہیں تین اقالیم سے بحث کرتی ہے لیکن ان میں دو اور انواع کا اضافہ کر دیتی ہے۔ یہ دونوں قسمیں بھی اس کے لیے اہم ہیں۔ شریعت ان کاموں کا

بیان کرتی ہے جو لوگوں کو لازما کرنا چاہیں یا بالکل نہیں کرنا چاہیں۔ نیز وہ کام جو کرنے کے ہیں اور جو کرنے کے نہیں ہیں۔ پھر وہ وضاحت سے یہ بھی بتا دیتی ہے کہ بہت سی چیز مباح ہیں جن سے شریعت کو غرض نہیں۔ سو شریعت کی رو سے ہمارے سامنے عمل کی پانچ قسمیں ہیں۔

ضروری یا لازمی جن کے کرنے کا مطالبہ شریعت میں موجود ہے۔

وہ کام جن کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اصطلاح میں اسے مندوب یعنی پسندیدہ کہا جاتا ہے۔

وہ امور جن سے شریعت کا تعلق نہیں۔

مکروہ یعنی ناپسندیدہ کام

ممنوع۔ وہ کام جن کے کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

اس طرح سے تقسیمِ امور کیجیے تو شریعت کے دائرے میں بہت سی ایسی چیز بھی آ جاتی ہے جو آج کی جدید معنوں میں کسی قانونی نظام میں شامل نہیں ہو سکتیں، مثال کے طور ''مندوب'' اعمال کی قسم کو لیجیے۔ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ پانچ ارکان دین سبھی لوازم کے زمرے میں آتے ہیں لیکن روزانہ پانچ فرض نمازوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد مندوب نمازوں کی بھی ہے۔ مثال کے طور پر نمازِ صبح کی دو فرض رکعتوں سے پہلے دو اور رکعتیں پڑھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اس طرح سب یومیہ نمازوں کے لیے کچھ تعدادِ رکعات ایسی ہے جسے فرض نماز کے ساتھ اضافہ کر کے پڑھنے کو ایک مستحسن کام کہا گیا ہے۔

روزے کے سلسلے میں یوں تو سال میں ایک مرتبہ رمضان کے مہینے کے روزے رکھنے فرض ہیں تاہم مسلمانوں کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ سال کے دوران کچھ اور دنوں میں بھی روزہ رکھا جائے، ہر ماہ کے کچھ خاص دنوں کا روزہ رکھا جائے بلکہ ہر ہفتے کے بعض دنوں کو روزے کے لیے خاص کیا جائے۔ اسی طرح جو مسلمان زکات دیتے ہیں ہوں ان کو اپنے منافع پر ایک خاص شرح سے زکات دینا لازم ہے لیکن ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دلائی گئی ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی اپنا مال خدا کی راہ میں دیا کریں۔ اسی طرح ضرورت مندوں کو قرض دینے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ قرض بلا سود ہونا چاہیے کیونکہ اسلام میں سود لینا ممنوع ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ خیرات کی بجائے قرض دینا زیادہ نیکی کا کام ہے۔ کیونکہ قرض لینے والے شخص پر ایک اخلاقی ذمہ داری اس کے واپس کرنے کی عائد ہو جاتی ہے اور اس طرح اسے ایک مستقل ذریعہ آمدنی تلاش کرنے کا خیال رہتا ہے۔ دوسری طرف جب قرض کی رقم لوٹائی جاتی ہے تو رقم کا مالک اسے کسی دوسرے شخص کی حاجت روائی کے لیے صرف کر سکتا ہے۔ یوں اسے مزید نیکی کرنے کا موقع ملتا ہے۔

دین کے پانچویں رکن حج کی بھی ایک شکل ایسی ہے جو مندوب میں شمار ہوتی ہے یعنی حج کے دنوں کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت۔ اس عبادت کو عمرہ کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو عمرہ بھی کرنا چاہیے اگر ان کو اس کی استطاعت حاصل ہو۔ چونکہ یہ ایک مندوب عمل ہے لہٰذا اسے تمام تر تفصیل کے ساتھ شریعت کی درسی کتب میں بیان کیا گیا ہے۔

بہت سی چیزیں شریعت کی رو سے کراہت کے زمرے میں آتی ہیں مثلاً طلاق، وضو میں ضرورت سے زائد پانی بہانا، نماز کے دوران بدن کھجانا، پرخوری کی

حد تک کھاتے جانا۔

غذا کے معاملے میں شریعت جس طرح احکام دیتی ہے وہ بسا اوقات مسیحی حضرات کو اچنبھے کی چیز معلوم ہوتا ہے (یہودیوں کے لیے یہ اجنبی چیز نہیں ہے)۔ مسلمانوں کے لیے نشہ آور مشروبات اور منشیات کا استعمال حرام ہے۔ خنزیر، کتے، پالتو گدھے اور مردار کا گوشت کھانا ممنوع ہے۔ مردار ہر اس جانور کا گوشت ہوتا ہے جسے شرعی قواعد کے مطابق ذبح نہ کیا گیا ہو۔ ذبیحہ کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جانور کی گردن تن سے جدا کرتے ہوئے اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ شرعی طریقے سے ذبح کیے ہوئے اس گوشت کو حلال کہا جاتا ہے۔ بعض فقہا کی رائے ہے کہ یہودی اور عیسائی لوگوں کا تیار کیا ہوا گوشت مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ دوسرے فقہا اس کے خلاف رائے دیتے ہیں۔ اس معاملے میں قرآن میں ایک عمومی حکم بیان ہوا ہے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ (۵:۵)

اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے۔

لیکن اس سے مراد یہی لیا جاتا ہے کہ یہ کھانا اگر گوشت کی شکل میں ہو تو اسے اللہ کا نام لے کر ذبح شدہ ہونا چاہیے۔ یہود کے ''کوشر'' طریقے سے ذبیحہ کا گوشت اس پیمانے پر پورا اترتا ہے۔ جانوروں کے گوشت کے بارے میں عمومی حکم یہ ہے کہ تمام پنجے، ناخن اور کچلیوں والے جانوروں کا گوشت کھانا ممنوع ہے ایسے جانور جو دانتوں، پنجوں سے شکار کرتے ہیں یا اپنے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں، مثلاً شیر ببر، شیر اور چیتا، بھیڑیا، ریچھ، ہاتھی، بندر اور بلی۔ فقہ کے ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ ان جانوروں کا گوشت کھانا مکروہ تو ہے حرام نہیں ہے۔ فقہا میں چھوٹا موٹا اختلاف

رائے ایک عام بات ہے۔چنانچہ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سمندر میں پائی جانے والی تمام جاندار چیزوں کا کھانا حلال ہے لیکن ایک مکتب فکر کے ہاں اس میں ایک استثناء ہے۔وہ مچھلی کے علاوہ دیگر جانوروں مثلاً کیکڑے، مگر مچھ، گھونگے اور فیل البحر کا گوشت جائز نہیں سمجھتے۔

تین کی جگہ پانچ انواع کی وجہ سے اسلامی قانون روزمرہ زندگی کی ہر طرح کی جزئیات پر نظر کرتا ہے جو ان کے سوا شاید زیر بحث نہ آسکتیں۔فقہ اسلامی کے بہت سے شعبے اور ذیلی موضوعات ہیں جن میں مہارت حاصل کرنا سالوں کی محنت اور مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔بعض مسلمان شرعی قانون کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے لیے عملاً سارا کا سارا دین بس اسی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔تاہم مسلمان اہلِ علم میں سے بہت سے عظیم المرتبت ہستیوں نے شریعت کے قانونی پہلو کو کھنگالنے میں اتنی مشغولیت سے خبردار کیا ہے کہ اس سے دین کی دوسری جہات لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں جبکہ یہ جہات بھی اسلام کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

امام محمد الغزالی (م ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) اسلامی علوم کے بڑے ماہرین میں سے ایک مشہور آدمی گزرے ہیں۔ان کی رائے یہ تھی کہ ہر مسلمان کو فقہ کا اتنا علم کافی ہے جو مرد و زن کی زندگی کی عملی ضروریات کے لیے درکار ہے۔اگر کسی مسلمان کو اپنے حالات کے مطابق کسی خاص حکم شرعی سے آگاہی کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا علم حاصل کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ایسے لوگ البتہ ہونا چاہئیں جو فقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں تاکہ حسب ضرورت ان سے کسی بھی معاملے میں فقہ کے احکامات معلوم کیے جاسکیں۔اس سے معاشرے میں فقہا یا

ماہرین فقہ و قانون کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لوگ جو ہر صورتحال کے مطابق مسلمانوں کو شرعی احکام کی تفصیلات سے آگاہ کر سکیں تاکہ عمل کرنے والوں کو ہر مسئلے پر فقہ کا حکم معلوم ہوتا رہے۔ ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ جب کوئی بچہ نماز سیکھنا چاہتا ہے تو کیا کرتا ہے؟ وہ خاندان کے کسی فرد سے کہتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنا سکھایئے۔ اس کے لیے کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی کیونکہ اکثر لوگ نماز کے موٹے موٹے مسائل سے واقف ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کو ایک طرح سے ہاتھ باندھنے کو کہے جبکہ دوسرا شخص ہاتھ باندھنے کے مختلف انداز پر اصرار کرے۔ ایسے میں آپ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ تیسرے آدمی سے رائے لیں گے۔ اس طرح پوچھتے ہوئے آپ علاقے کی مسجد کے پیش امام کے پاس پہنچیں گے جو عموماً ان معاملات میں سب سے باخبر آدمی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امام مسجد بھی معاملاتِ فقہ میں مہارت نہ رکھتا ہو اور اگر آپ کا سوال ذرا گہرا ہوا تو وہ آپ کو کسی فقیہ کے پاس بھجوا دے۔ اس سے آپ مسئلے کی تفصیلات کا علم حاصل کر سکیں گے۔ ضروری نہیں کہ یہ حرفِ آخر ثابت ہو۔ فقہ کے ماہرین اور بھی ہوں گے اور دیگر علوم کے ماہرین کی طرح فقہ کے ماہرین میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ذمہ داری آپ کی ہے کہ سوال کرتے رہیں تا آنکہ جواب سے آپ کی تشفی ہو جائے۔

گناہ

شریعت نے صحیح عمل کے قواعد متعین کر دیئے ہیں۔ یہ قاعدے فرمانِ خداوندی نے مقرر کیے ہیں جو قرآن میں بیان ہوا اور نبی علیہ السلام نے اس کی وضاحت فرمائی۔ قرآن اور حدیث شریعت کے دو بنیادی ماخذ ہیں۔ علماء جب ان سے کسی

مسئلے کے حل کے لیے رجوع کرتے ہیں اور سوال پھر باقی رہتا ہے تو گزرے ہوئے بڑے مسلمان علماء کی رائے دیکھی جاتی ہے جو شریعت کے مسلّمہ ماہرین گنے جاتے ہیں۔ بنابریں اجماع (اتفاق رائے) کو شرعی احکام کا تیسرا ماٴخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنی مسلمانوں کے ہاں قیاس کو چوتھا ماٴخذ مانا گیا ہے جبکہ شیعہ حضرات عقل کو چوتھے ماٴخذ کا درجہ دیتے ہیں۔

اگر لوگ شریعت میں بیان کردہ ہدایتِ خداوندی کو مان کر اس پر عمل پیرا ہوں تو اسے ''اطاعت'' کہا جاتا ہے۔ عملِ صحیح کا رِاطاعت ہے۔ اللہ یا اس کے رسول کا فرمان ہوتا ہے کہ ''یوں کرو'' یا ''یوں مت کرو''۔ اچھا مسلمان یہ ہدایات بجا لاتا ہے۔ قرآن نے اکثر ''اطاعت'' کا لفظ عملِ صحیح کے حوالے سے استعمال کیا ہے:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۳:۱۳۲)

اور اللہ اور رسول کا حکم مانو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۵:۹۲)

اور حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم پھر و گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف یہی ہے کہ کھول کر پہنچا دے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ (۴۸:۱۷)

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا اس کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ

عَلَيۡهِمۡ (٤:٦٩)

اور جو لوگ اللہ کے حکم میں چلتے ہیں سو وہی ان کے ساتھ ہیں جن کو اللہ نے نوازا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيۡنًا (٣٣:٣٦)

اور کسی مومن یا مومنہ کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف چلا سو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

اگر فرمانبرداری و اطاعت عملِ صحیح کے مترادف ہے تو نافرمانی یا معصیت غلط کام کے ہم معنی ہے۔ حکمِ خداوندی کے خلاف کرنے کا عمل حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے کہ انہوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھ لیا تھا۔

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (٢٠:١٢١)

اور آدم نے اپنے رب کا حکم ٹالا تو راہ سے بہک گئے۔

عصیان ان لوگوں کی صفت ہے جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت سے گریز کرتے ہیں۔ شریعت اللہ اور نبی علیہ السلام کے احکامات کی مدون شکل ہے، یوں شریعت سے نافرمانی کا مطلب ہوگا اللہ کی نافرمانی اور اس کے حکم سے روگردانی۔ درج ذیل آیت سے جو معانی اخذ کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کیونکہ ''اولوالامر'' کے الفاظ کو ان اہلِ علم کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے جن کو اہل اسلام کے لیے شریعت کی شرح و وضاحت کرنے کی مطلوبہ استعداد اور مہارت حاصل ہو۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور جو اختیار والے ہیں تم میں۔ اور اگر پھر

فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴:۵۹)

تمہارا کسی چیز میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور اس رسول کی طرف لوٹا دو۔

قرآنِ مجید میں ''عصٰی'' (نافرمانی، حکم عدولی) کا لفظ بہت سی آیات میں استعمال ہوا ہے۔ عموماً اس کا محلِ استعمال وہ مباحث ہیں جہاں گزرے ہوئے پرانے نبیوں اور رسولوں کا انکار کرنے والوں کے طرزِ عمل کا ذکر آیا ہے۔ مسلمان کے لیے اس میں جو سبق ہے وہ صاف ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۴:۱۳-۱۴)

یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلے گا اس کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں ندیاں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یوں انہیں بڑی مراد ملے گی۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی بے حکمی کرے گا اور اس کی حدوں سے بڑھ جائے گا اس کو آگ میں داخل کرے گا، رہے گا اسی میں اور اسے ذلت کی مار پڑے گی۔

اسلام کے بارے میں لکھنے والے عموماً ''معصیت'' کے لفظ کا ترجمہ ''گناہ'' sin سے کرتے ہیں اور یہ درست ہے کہ یہ لفظ اپنے عمومی مدلول کے طور پر گناہ کا مفہوم رکھتا ہے۔لیکن معصیت ایک خاص طرح کا گناہ ہے،وہ گناہ جس کا تعین خدا کے اوامر ونواہی کے حوالے سے ہوتا ہے اور اس لفظ کے ساتھ ہی اس کا الٹ یعنی ''طاعت'' کا لفظ ذہن میں ابھرتا ہے۔قرآن نے اور بھی کئی الفاظ ایسے برتے ہیں جن کا ترجمہ ''گناہ'' کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔دیگر الفاظ کے علاوہ ذنب، اِثم اور خَطِیۃ کے الفاظ اس معنی میں آئے ہیں۔ان میں سے ہر لفظ میں معنی کی پرتیں اور رنگ ہیں جو انہیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ sin کا لفظ اسلام کے تناظر میں معصیت کے لفظ کا ایک نہایت مبہم ترجمہ قرار پائے گا کیونکہ اس میں کئی طرح کا عمل شامل ہو جاتا ہے۔

ان سب اصطلاحات میں ایک بات مشترک ہے۔گناہ کا ذکر کرنے کا مطلب ہے انسانی عمل کے بارے میں فیصلہ دینا اور حکم لگانا اور یہ شریعت کے قلمرو ہے۔شریعت نیتوں کے معاملے سے صرفِ نظر نہیں کرتی لیکن نیت اور ارادے کی جانچ کے لیے اس کو تقریباً ہمیشہ ہی عمل سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔وہ علماء جو نیتوں کے معاملے پر اسلام کی تیسری جہت کے تناظر میں غور کرتے ہیں ان کے ہاں گناہ کے مسئلے سے جڑے ہوئے گہرے اخلاقی اور روحانی سوالات کا کہیں زیادہ وسیع شعور پایا جاتا ہے۔

گناہ اور معصیت کی اس بحث کو اختتام تک لے جانے کے لیے مناسب ہوتا کہ عملِ صالح کے عمومی قرآنی تصور کا کچھ بیان کر دیا جائے۔یعنی وہ نیک کام اور اچھے اعمال کیا ہیں جن کی بجا آوری انسان کو فرمانبردار بناتی ہیں۔لیکن ہم یہ بحث

کتاب کی حصہ سوم کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔اس حصہ تک پہنچیں گے تو ہماری تحریر کا پس منظر اتنا واضح ہو چکا ہوگا کہ عملِ صالح کو اسلام کی ہر تین جہات سے مربوط کر کے دیکھا جا سکے گا۔اس جگہ صرف اتنا ذکر کیے دیتے ہیں کہ قرآن میں اچھے کام اور نیک عمل کے لیے عموماً جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے وہ ہے ''صالحات''۔اس کا ترجمہ انگریزی میں wholesome deeds کیا جا سکتا ہے۔اردو میں کھول کر کہیے تو وہ عمل جو مفید و سودمند اور موافق ہو۔جو لوگ صالحات پر عمل پیرا رہتے ہیں ان کو ''صالحون'' کا نام دیا جاتا ہے۔

جب قرآن یا اسلامی روایتی علوم میں ''صالحات'' یا نیک اعمال کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے وہ عمل جو فرمانِ خداوندی کی اطاعت کا مظہر ہو۔صالحات میں سب سے بنیادی عمل پانچ ارکانِ دین ہیں جن کا ہم نے سابقہ صفحات میں بیان کیا ہے لیکن ہر نیک عمل اس قبیل میں شامل ہے یعنی وہ سب کام جن کو شریعت اچھا اور نیک عمل قرار دیتی ہے۔مزید براں اسلام کی دوسری اور تیسری جہت کے ماہر علماء اس اصطلاح کے مفہوم کو پھیلا کر دیکھتے ہیں اور یوں ''نیکی'' اور ''خیر'' کی ایک وسیع تر تعریف اس میں شامل ہو جاتی ہے۔

باب دوم

"اسلام" کا تاریخی پیکر

علماء وہ لوگ ہیں جنہیں دین کا علم حاصل ہے۔اس تعریف کے مطابق سب سے زیادہ علم رکھنے والی ہستی اللہ تعالی کی ہے۔اللہ کے اسماء میں سے ایک "العلیم" بھی ہے۔نوع انسانی میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلمکو ہر انسان سے زیادہ علم کا حامل مانا گیا ہے۔آپؐ نے خود فرمایا،"مجھے زمین و آسمان کی ہر شے کا علم دیا گیا"۔سو فطری بات ہے کہ شریعت کی تعلیم دینے میں اوّلیت اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی علیہ السلام کو حاصل ہے۔قرآن اور حدیث اسی عمل تعلیم کے مظہر ہیں۔

قرآن اور سنت

اسلامی علوم کو ترتیب دینے میں رسولِ خداؐ کا جو کردار رہا ہے اسے کم نہ جانیے اصولی طور پر تو ہر چیز قرآن میں موجود ہےلیکن اسلام اور اس کی عبادات کے بارے میں تفصیلات کی ایک کثیر تعداد صرف احادیث کے ذخیرے میں پائی جاتی ہے۔مثلاً یہ دیکھیے کہ قرآن میں بار بار نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہےاور مختلف آیات سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ نماز کی ادائی کے لیے سیدھا کھڑا ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا اور دو زانو بیٹھنا ہوتا ہے۔اسی طرح قرآن سے یہ چیز وضاحت سے سمجھ آتی ہے کہ نماز پڑھنے سے پہلے نمازی کو پاک ہونا چاہیے۔لیکن قرآن میں کہیں بھی نماز کا اور وضو یا غسل کا تفصیلی طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔لہٰذا حضورؐ کی سنت یعنی آپؐ کا اسوۂ عمل دین کا

علم حاصل کرنے کے لیے مطلقاً لازمی چیز ہو جاتی ہے۔ یہ سنتِ نبوی حدیث کے ذخیرے میں محفوظ کی گئی ہے۔ آنحضرتؐ ہی نے لوگوں کو سکھایا کہ انہیں نماز کے لیے کیسے کھڑا ہونا ہے، کیونکر جھکنا ہے اور سجدہ کرنا ہے اور ان کے ساتھ کون سی قرآنی آیات کی تلاوت کرنا ہے یا کلماتِ حمد و تسبیح ادا کرنا ہیں۔

آنحضرتؐ کے قریبی اصحاب میں سے کئی حضرات نے شریعت کا علم سکھانے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں نہایت ہی اہم کردار انجام دیا ہے۔ ان اصحاب نے آپؐ کو مختلف مواقع پر خطاب کرتے ہوئے سنا، آپؐ کو عمل کرتے دیکھا۔ بعد ازاں ان حضرات نے آپؐ کے قول و فعل کو دوسرے لوگوں کے لیے بیان کیا، ان سے روایت کی۔ ان ساتھیوں میں آپ کی زوجہ محترمہ سیدنا عائشہؓ اور آپؐ کے عم زاد اور داماد سیدنا علیؓ سب سے اہم ہیں۔ حدیث کی کتب میں آپؐ کے صحابہ کی سینکڑوں روایات محفوظ کی گئی ہیں۔

اسلام بنیادی طور پر ایک عملی روش ہے، ایک اندازِ زیست، خدا اور اس کے مخلوق سے یگانگی و ہم آہنگی استوار کرنے کا ایک قرینہ۔ اپنے وسیع کائناتی معنی میں اسلام عبارت ہے حکمت اور امرِ خداوندی کے سامنے ہر شے کی سرافگندگی اور تسلیم و فرمانبرداری سے۔ اسی طرح ایک خاص اور انسانی معنوں میں اسلام کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور انسانی معاشرہ، اللہ کے دیئے ہوئے نقشے کے مطابق اپنے فرضِ منصبی کو ٹھیک ٹھیک انجام دے رہا ہو۔ زندگی کرنے کا یہ صحیح طریقہ اور قرینہ دیگر ہر چیز سے پہلے عمل اور طریقِ عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ عمل کا دارومدار علم اور ارادے پر ہے یعنی اس کا تعلق امکاناتِ عمل کو جاننے اور شعوراً ایک راہِ عمل پر گامزن ہونے سے ہے۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے مناسب مقام و محل پر ہم اس کا ذکر

کریں گے۔ سرِ دست ہم یہ نکتہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کا پیانہ اور معیار بنیادی طور پر وہ خارجی عمل ہے جو انسان کو انجام دینا ہوتا ہے۔

سو اچھا مسلمان ہونے کا مطلب رسول خداؐ کی سنت کی پیروی کرنا ہے یعنی ہر کام اس طرح انجام دینا جیسا آنحضرتؐ نے کیا تھا۔ حضورؐ کا اہم ترین عمل یہ تھا کہ آپؐ کو اللہ کے ہاں سے قرآن ملا اور آپؐ نے اس کے ذریعے دینِ اسلام کو محکم و استوار کر دیا۔ آپؐ کے پیروکار قرآن کو اللہ سے براہ راست حاصل نہیں کر سکتے لیکن رسول خداؐ کے وسیلے اور وساطت سے قرآن بالواسطہ ان تک پہنچا ہے۔ مسلمان کی قرآن تک رسائی اور اس سے آگاہی قرآن سیکھنے، اسے یاد کرنے اور اس کی تلاوت کرنے سے عبارت ہے۔

حفظِ قرآن یعنی قرآن زبانی یاد کرنا ایک مذہبی عمل کے طور سب سے زیادہ باعث اجر اعمال میں سے سمجھا جاتا ہے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ روایتی اسلامی تعلیم کی بنیاد قرآن یاد کرنے کے عمل پر اٹھائی گئی ہے۔ ہر مسلمان قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور یاد کرتا ہے کہ سورۃ فاتحہ اور دیگر چند سورتوں کے یاد کیے بغیر نماز ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ نماز سے مسلمانوں کے اندر ہر روز قرآن کی ایک تازہ بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے سامانِ ہستی میں نماز کو وحیِ قرآنی کی اولین اور اساسی تجسیم کی حیثیت حاصل ہے۔

انسانی زندگی میں عمل کی بنیادی حیثیت کو نظر میں رکھیے تو یہ بات باعث تعجب معلوم نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کو اگر کسی شخص کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ اسلام کو مانتا ہے یا نہیں تو اس کی جانچ اس کے عمل سے کی جاتی ہے۔ تاریخ کا جائزہ لیجیے تو یہ بات یقینی قرار پاتی ہے کہ دین کے تمام اساسی اعمال عہدِ نبوی سے متواتر چلے

آ رہے ہیں۔زندگی میں ہر ہر موقع پر کیا عمل، کس طور کیا جانا چاہیے،اس کے بارے میں مسلمان ہمیشہ ہی بہت چوکس اور بیدار رہے ہیں۔وہ پوری توجہ اور احتیاط سے رسولِ خداؐ کی بات سنتے تھے،آپؐ کے عمل کو غور سے دیکھ کر یاد رکھتے اور جو سیکھتے تھے اسے اپنی زندگی کے عملی سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔شریعت کی تفصیل وترتیب کو بنیاد اور اساس اللہ کے انہی نیک طینت اور مخلص بندوں کے عمل نے فراہم کی تھی۔ یہ بندگانِ خدا اپنے ہر عمل کا نقشِ اوّل اس کی اوّلین مثال، نبی علیہ السلام کی سنت سے اخذ کرتے تھے۔

اسلام کے اعمال دینی کو تاریخ میں مسلمانوں نے عہدِنبوی کے بعد کس طرح نسل بہ نسل منتقل ومحفوظ کیا، اس کی تفصیلات ہمارا موضوع نہیں ہیں۔یہ جزئیات بہ تمام وکمال معلوم نہیں ہیں۔جدید مورخین نے اس تاریخی عمل کا خاکہ ترتیب دینے میں بہت سر کھپایا ہے۔کامیابی کچھ زیادہ نہیں ہو سکی۔لیکن سنت کے تواتر سے منتقل ہونے کا حاصل ہمارے سامنے ہے۔شریعت پر عمل کرنے کے کئی مسلمہ طریقے اور راستے ہمارے لیے متعین ہو چکے ہیں۔

مذاہبِ فقہ

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، سال صدیوں میں بدلتے رہے، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی سنت انسانوں کے زندہ حافظے میں رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگی۔سو یہ ضروری ٹھہرا کہ آپؐ کی زندگی اور آپ کے عمل کی تفصیلات وجزئیات کو تحریراً محفوظ کر دیا جائے مبادا یہ معلومات ہمارے ذہن سے اوجھل ہو جائیں۔ساتھ ہی ساتھ وہ تمام معاملات جن میں اسلام نے اپنا آپ مستحکم کرلیا تھا انہی تمام مسائل کی زد میں آتے چلے گیے جو انسان کی ہست وبود کا خاصہ ہیں۔اسلام کو بھی اختلاف

رائے ، اقتدار کی کشاکش، محبت اور نفرت اور قدرتی نیز انسان کی لائی ہوئی آفات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہ الفاظ دیگر، تاریخ کا دھارا اپنے معمول پر بہنے لگا لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ اب انسان اور انسان کے رشتے کو قرآن اور سنت کی رو سے طے ہونا تھا۔ قرآن اور سنت تاریخ میں اپنا مقام ثبت کر چکے تھے۔

آئینہ ایام میں اس زمانے کا عکس گویا ہر زمانے کی صورت گری کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں سیدنا علیؓ کا ایک قول تو ایسا ہے جو گویا مستقبل کے ہر مورخ کی تحریر کو سمیٹ کر بیان کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا، ''وقت دو طرح کا ہوتا ہے، یا تو وقت تمہارا ساتھ دے گا یا تمہارے خلاف جائے گا''۔ مگر انہوں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ ان کے سامنے قرآن کی مثال تھی جو تاریخی واقعات کا بیان ہی اس لیے کرتا ہے کہ اس سے انسان اور اس کے رب کے مابین تعلق کے بارے میں ہمیں عبرت آموزی اور ہدایت کا سبق دے سکے۔ لہٰذا ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ دو بنیادی فضائل اخلاق، دو بنیادی رویے ہر انسان کو اپنے اندر راسخ کرنا چاہئیں۔ ''جب زمانہ تمہارے ساتھ ہو تو خدا کا شکر ادا کرو اور جب زمانہ تم سے منہ پھیرے تو صبر کرو''۔

ابتدائے اسلام میں رسولِ خدا کی سنت کی پیروی کرنا اور مسلمان ہونا ایک ہی بات تھا۔ اپنے بڑوں کو دیکھ کر لوگ بآسانی سنت کی پیروی کا طریقہ سیکھتے تھے۔ اسی سے آپؐ کے اس ارشاد کے معنی اجاگر ہوتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا، ''میرے صحابہ تو ستاروں کی مانند ہیں، جس کے بھی نقش قدم پر چلو گے/جس سے بھی راہ معلوم کرو گے ہدایت پاؤ گے''۔ صحابہ کے بعد تابعین (Followers) کا زمانہ آیا۔ ان حضرات نے صحابہ کی آنکھیں دیکھی ہوئی تھیں۔ اسلام جب تک ایک

نسبتاً مختصر گروہِ مردم کا دین تھا اور مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوئی تھی ہر ایک کا ایمان اور عمل، اخلاص اور شوقِ عمل سے معمور تھا۔ اس زمانے تک تو اچھا مسلمان ہونے کے لیے یہ بات کافی تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں اور استادوں کو دیکھ کر دین سیکھیں اور ان کی مثال کو سامنے رکھیں۔ مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اسلامی معاشرہ جس کی بنیاد اسلام کی تین جہات پر اٹھائی گئی تھی، پھیلتا اور وسیع ہوتا گیا۔ اسلام کی ابتدائی فتوحات سے معاشرے میں ہر طرف دولت کی ریل پیل ہونے لگی۔ کتنے ہی مسلمان ایسے رہے ہوں گے جن کی نظر دین کے اصل ہدف اور مقصود سے ہٹ کر کارِ دیگر میں الجھ گئی۔ اس نقطے پر آ کر دین کا علم سمٹنا شروع ہوا اور یہ بتدریج گنے چنے لوگوں تک محدود ہونے لگا۔ اہلِ علم کے اس طبقے نے مناسب یہ جانا کہ اپنے علم کو نسبتاً کم طلباء تک منتقل کر دیں، ایک آدھ کتاب لکھ دیں کہ اس طرح علم کی اساسیات، ضروری باتیں محفوظ ہو سکیں۔

خلاصہ یہ کہ ہوتے ہوتے سنت کا علم ایک خاص شعبہ علم قرار پایا۔ مزید براں یہ ہوا کہ جیسے جیسے اسلامی معاشرے کی حدود وسیع ہوتی گئیں زندگی کے تقاضوں، حالات کے نشیب و فراز اور آنے والے وقت کے بطن سے پھوٹنے والے امکانات نے مسلمانوں کو ہر طرح کے انسانی تجربات کے روبرو لا کھڑا کیا۔ انھیں ان سب معاملات کا سامنا کرنا اور ان کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرنا پڑا۔ اب اگر اسلام عملِ صحیح اور راہِ صواب سے عبارت ہے اور ساری دنیا، ساری زندگی اس کے دائرے میں شامل ہے تو اس کا لازما مطلب یہ تھا کہ سنت پر عمل کرنے کے آرزومند اور کوشاں مسلمان ہر معاملے کو اسی نگاہ سے دیکھیں، کسی ایک بات کو بھی نظر انداز نہ کریں۔

اب اگر کسی ایسی صورتحال، کسی ایسے معاملے کا سامنا کرنا پڑے جو رسولِ خداؐ کی زندگی میں کبھی اٹھا نہ تھا تو پھر لوگ کیا کریں؟ دوسری طرف یہ بھی دیکھنا پڑا کہ اگر آپؐ کے عمل کے بارے میں دو یا اس سے زیادہ باتیں ان کے علم میں آئیں اور یہ روایتیں باہم مختلف ہوں تو پھر کیا راہِ عمل اختیار کی جائے؟ صحیح روایت اور درست خبر کا فیصلہ کیونکہ ہو؟ یہی مسائل تھے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ متعدد الگ الگ ''مذہب'' کے (پگ ڈنڈیاں چلے ہوئے راستے) trodden paths بن گئے۔ان میں سے ہر ایک قدرے مختلف اندازِ فہم کا نمائندہ تھا۔رسول خداؐ کی سنت اصل میں کیا ہے اور اس کو انسانی زندگی اور معاشرے پر کیونکر لاگو کیا جائے، اس بات کو جاننے اور سمجھنے کا ہر ایک کا ذرا الگ الگ اسلوب تھا۔ہم نے ''قدرے مختلف'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔یہ آج ہم کہہ رہے ہیں عہدِ جدید میں کھڑے ہو کر اور اس کے تناظر میں۔ورنہ اپنے زمانے میں یہی اختلاف بہت بنیادی اختلاف کے طور پر ظاہر ہوتے تھے اور ایسا بھی ہوا کہ آراء کا تصادم بالآخر باقاعدہ لڑائی کی طرف لے گیا (لڑائی کے بارے میں البتہ یہ یاد رہے کہ اس کی نوبت مختلف سماجی اور سیاسی محرکات اور عناصر کو معاملے میں آمیخت کرنے سے ہی آتی تھی)۔شروع زمانے میں یہ مکاتبِ فکر، یہ راہِ عمل بیسیوں کی تعداد میں تھے اور ان میں سے ہر ایک کا مرکزی نقطہ کسی بڑے اہلِ علم کی تعلیمات تھیں، کوئی ایسا شخص جسے سنت کا گہرا اور وافر علم میسر ہو۔وقت گزرنے کے ساتھ یہ مکاتبِ فکر یا تو منظرِ عام سے اٹھ گئے یا ایک دوسرے میں مل کر یک نظر و ہم آہنگ ہو گئے۔مآل کاران میں سے چار مکاتبِ فکر کو سنیوں میں یکساں طور پر مستند مکاتبِ فکر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔مسلمان ان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتے ہیں اور یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی اگر آپ ایک راہِ عمل کو دوسری سے ملا دیں۔ایک مسئلے میں کسی

ایک کو اختیار کرلیں اور دوسرے معاملے میں دوسری راہ پر گامزن ہونے کو ترجیح دیں۔

رسولِ خداؐ کی سنت کے مختلف اسالیب کو بیان کرنے کے لیے جو لفظ استعمال ہوا وہ تھا ''مذہب''۔ اس لفظ کا اصل ہے ''ذَھبَ'' یعنی ''جانا''۔ ''مذہب'' ایک طریقہ اور انداز ہے جانے کا یا چلنے کا، ایک راستہ، پگ ڈنڈی، گزرگاہ، چلتا ہوا رستہ۔ اس کا ترجمہ بسا اوقات ''فقہی مکتبِ فکر'' (School of Law) یا ''قانونی مکتبِ فکر'' (School of Jurisprudence) کی اصطلاحات سے کیا جاتا ہے۔ اسلام پر عمل کرنے کا ہر درست اور صحیح طریقہ شاہراہِ سنت پر ہی گامزن ہونے کے مترادف ہے۔ ان میں سے ہر ایک، شریعت کی تعبیر وتشریح اور اس کے اطلاق کا ایک اسلوب اور انداز ہے۔

اہلِ سنت کے چار مذاہبِ فقہ اُن چار حضرات کے نام سے منسوب ہیں جنہیں ان مذاہب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں ان کے مکتبِ فقہ کے اصول وقواعد مدوّن ہوئے اور اس مکتب کو دوسرے مکاتبِ فقہ سے الگ ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ مذاہبِ فقہ کے چار بانی حضرات کے نام ہیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء)، امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء)، امام الشافعی (م ۲۰۴ھ/ ۸۲۰ء) اور امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ/ ۸۵۵ء)۔ شیعہ حضرات کی اکثریت پانچویں مذہب یا مکتبِ فقہ کی پیروکار ہے جسے ان کے چھٹے امام جعفر صادق (م ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ امام جعفر صادق امام ابو حنیفہ کے استاد بھی تھے۔

ان مذاہب میں میں باہمی فرق کوئی بہت بڑا نہیں ہے، کم از کم بہ نظرِ ظاہر تو

کوئی بنیادی اختلاف نہیں پایا جاتا اور سر دست ہمیں اسی نقطۂ نظر سے بات کرنا مقصود ہے۔ کسی ایسے غیر مسلم سے بات کیجیے جو شریعت سے آگاہ نہ ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اسے ان مذاہب کے فرق کو سمجھنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔ مثلاً اسے یہ پتہ نہیں چلتا کہ الگ الگ فقہی مسلک کے مسلمان نماز پڑھنے میں ایک دوسرے سے کس طرح مختلف ہیں۔ فقہ اور اُصولِ فقہ کے ماہرین البتہ آپ کو نماز کے ہر ہر مرحلے اور نماز کے جملہ مراسم میں جزئیات کا باریک فرق بتا سکیں گے۔ مختلف مکاتبِ فقہ میں بعض مسائل اور نکات پر اتفاق رائے ملتا ہے اور دیگر معاملات میں ان کی رائے ایک دوسرے سے الگ ہے۔ جعفری یا شیعہ مکتبِ فقہ بھی اس اعتبار سے دوسرے مذاہب سے جدا نہیں ہے بلکہ بہت سی باتوں میں اسے حنفی فقہ سے خاص طور پر قریب کہا جا سکتا ہے۔ دو معاملات البتہ ایسے ہیں جن میں جعفری مکتبِ فقہ کا معمول ایسا ہے جو اسے چاروں سنی مذاہب سے الگ کر دیتا ہے۔ پہلی چیز متعہ یعنی وقتی نکاح کی اجازت ہے اور دوسری زکات کی ایک خاص شکل جسے خمس (پانچواں حصہ) کہا جاتا ہے۔ یہ امام کا حق گردانا جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں بہت سے مذاہبِ فقہ پائے جاتے تھے لیکن آخر آخر کر سبھی سنی مسلمان چار مذاہب میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہو گئے۔ جب یہ مذاہب راہِ صواب اور صحیح اندازِ عمل کے طور پر معاشرے میں قائم ہو گئے تو اس کے بعد شریعت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس بات میں اتنی صداقت ہے کہ اکثر یہاں تک سنا جاتا ہے کہ احکاماتِ شریعت طے کرنے کے ضمن میں ''اجتہاد کا باب'' تو اب بند ہو چکا۔ تاہم بہت سے بڑے علماء نے بابِ اجتہاد کے بند ہونے کی اس رائے کو لائق اعتناء نہیں جانا اور معاملات شرعی میں اپنی

صوابدید کے مطابق اجتہاد سے کام لیتے رہے۔شیعہ حضرات تو اس رائے کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔ان کا کہنا ہے کہ بابِ اجتہاد بند ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کسی گزرے ہوئے عالم کی فقہی اور قانونی رائے پر عمل کرنا ان کے ہاں روا نہیں رکھا گیا۔

اہلِ مغرب نے اسلام کے بارے میں جو تحقیق و تصنیف کی ہے اس میں شروع میں ایک رجحان بہت عام تھا۔بابِ اجتہاد کے بند ہونے کے حوالے سے بہت باتیں کی جاتی تھیں اور ان میں نیت یہ رہتی تھی کہ اس نکتے کو اسلامی قانون کے جامد ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے اور یہ باور کروایا جائے کہ اسلام کی وجہ سے قانونی اور فقہی سوچ بے کار اور بے اثر ہو گئی۔مغربی اہلِ علم اپنی تحریروں میں یہ جتانے کی عموماً کوشش کرتے رہے ہیں کہ ان جیسے جدید انسان تو نہایت فعال، متحرک اور زیرک ہوتے ہیں جبکہ گزرے ہوئے وقتوں کے لوگ کچھ دوں نظر، کم فہم اور تیزیِ ادراک سے محروم ہوتے تھے۔آجکل کے لکھنے والے اس طرح نہیں سوچتے۔انہیں احساس ہو چلا ہے کہ ان پرانی تحریروں میں سے بہت سی آراء دون کی لینے اور اپنی داد آپ دینے کے عملِ خودستائی کا شاخسانہ ہیں۔غیر مغربی معاشروں کے بارے میں صادر کیے گئے یہ فیصلے درمدحِ خود کی ذیل میں آتے ہیں۔چنانچہ بنیادی مآخذ کی دوبارہ پرکھ پڑتال آج کے اہلِ علم کا شیوہ ہونا چاہیے۔ نتیجہ یہ کہ اسلام کی قانونی اور فقہی فکر کے بارے میں اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ اس کے کئی شعبوں میں بہت فعالیت اور فکری سرگرمی جاری رہی ہے بالخصوص جن معاملات میں نئے نئے سوالات اور تغیر پذیر حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور عملِ تغیر سے حالات میں تبدیلی واقع ہونا ایک فطری چیز ہے۔

بابِ اجتہاد کے بند ہونے کی رائے اگر بڑی حد تک درست کہی جا سکتی ہے تو دین کے پانچ ارکان کے بارے میں۔ وہ پانچ بنیادی اور اساسی عمل جو سنتِ نبوی نے متعین انداز میں طے کر دیے ہیں۔

فقہ اور سیاست

اہلِ فقہ علماء کا وہ طبقہ ہے جو شریعت میں خاص مہارت رکھتا ہے۔ ہر فقیہ کو عموماً کسی ایک فقہی مکتبِ فکر میں خصوصی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض علماء دوسرے مکاتبِ فقہ کا بھی علم رکھتے ہیں۔ عیسوی ذہن سے سوچیے یا مابعد عیسائیت نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو فقہ و قانون کا ''روحانیت'' Spirituality سے کوئی ربط و تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ اس رائے میں کسی حد تک صداقت ہے۔ مسلمان علماء میں سے کئی حضرات نے بھی صدیوں تک ایسی ہی آراء کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے کہ فقہا تمام جزئیاتِ عمل پر نہایت تفصیل سے نظر کرنے کے عادی ہیں اور ان کے بارے میں معروف ہے کہ وہ وکیلوں کی طرح ایک ہی راگ الاپتے رہتے ہیں۔ فقہ وہ علم ہے جو بال کی کھال نکالنے میں مزا حاصل کرتا ہے۔ اسلام میں یہ ایک ضروری شعبۂ علم ہے لیکن اگر سارا زور اسی پر ہو جائے تو اسلام کی باقی جہتوں پر جو توجہ دینا چاہیے اس میں کمی آ جائے گی۔

آج کے قانون دان حضرات کی طرح اسلامی قانون کے ماہرین میں سے بہت سے علماء کو بھی سیاست سے گہرا شغف تھا اور وہ سیاسی معاملات میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ پھر شریعت میں بہت سے احکامات اور قوانین ایسے بھی مقرر کیے گئے ہیں جن کی ایک عمومی سماجی حیثیت ہے خاص طور پر وہ احکامات جن کا تعلق لین دین کے معاملات اور باہمی معاہدوں سے ہے۔ مزید براں قرآنِ مجید میں عدل و

انصاف کو انسانی تعلقات اور معاملات میں ایک جگہ دی گئی ہے۔ زکات کے نظام سے سرمایہ و دولت کی تقسیم کے لیے ٹھوس قاعدے اور قانون وجود میں آتے ہیں۔ انفاق اور صدقات کی دیگر صورتوں کی ترغیب دی گئی ہے۔

قرآن اور صاحب قرآن نے بلا شبہ انسانی معاشرے کے لیے ایک لائحہ عمل دیا ہے اور اسلام کی تاریخ اس لائحہ عمل کی کامیاب تعمیل کی شہادت دیتی ہے۔ تاہم قرآن اور حدیث دونوں ہی میں حکومت چلانے اور کارِ جہانبانی کے طور طریقے کی صراحت نہیں کی گئی۔ مسلمانوں میں شروع میں جو فلسفی ہوئے ان کی طرف سے سیاسی نظریات پیش کیے گئے لیکن عملاً یہ نظریات کبھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اسلام کی تاریخ میں ہوا یہ کہ اس وقت کے رائج الوقت سیاسی ادارے اور نظام پہلے کی طرح چلتے رہے۔ یہ نظام بنیادی طور پر بادشاہی نظام تھا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی خلافت بظاہر تو اسلامی حکومت کے طور پر قائم تھی مگر تھیں تو موروثی بادشاہیت ہی کی ایک صورت۔ خلیفہ چونکہ اپنی حکومت کا جواز اسلام ہی کے دامن میں تلاش کرتا تھا لہٰذا اسے لازماً شریعت کو قانونِ وقت کے طور پر قبول کرنا ہوتا تھا۔ خلفاء میں سے کئی حکمران اپنی ذاتی زندگی میں شریعت پر پوری دیانت سے عمل بھی کرتے تھے۔ کچھ ایسے بھی رہے جن کے بارے میں اس کے برعکس روایت کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کا بہر حال خیال یہی تھا کہ بادشاہ اور خلیفہ کو اس وقت تک جائز حکمران تسلیم کیا جاتا رہے گا جب تک وہ کھلم کھلا شریعت کو رد نہ کر دے۔

عام طور پر سننے میں آتا ہے کہ اسلام میں نظام حکمرانی کو دین کے دائرے سے باہر نہیں رکھا گیا۔ یہ بالکل درست ہے۔ اسلام کی نظر میں دنیا کی کوئی چیز خداوند قدوس کی قلمرو سے باہر نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کی تاریخ میں جو

بھی حکومت گزری ہے وہ نیک اور مخلص مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ شریعت کی پابندی کا عندیہ رکھتے تھے۔ شاہان و سلاطین دنیائے دوں کی غلامی پر مائل لوگ تھے۔ یہی حال ان دیگر لوگوں کا بھی تھا جو عام طور پر کاروبارِ مملکت میں شمولیت اختیار کرتے تھے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ یہ کہا گیا کہ حکومت کو شریعت نافذ کرنا چاہیے اور امورِ سلطنت کی باگ ڈور اچھے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ استثناء کی بات اور ہے۔ بعض مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ اسلامی معاشرے پر ایک نیک مسلمان کی حکمرانی کی آخری مثال خلیفۂ چہارم سیدنا علیؓ میں ملتی ہے اور خلافتِ بنو امیہ سے لے کر آج تک اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کے معاملے میں حکومت کا کردار مسلسل زوال کا شکار ہی رہا ہے۔

آج کی جمہوری اسلامی ریاستیں اس عمومی قاعدے سے باہر نہیں ہیں۔ زیادہ تر تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ دین ان لوگوں کا جدید ترین حربہ بن گیا ہے جو خود ہوسِ اقتدار کے اسیر ہیں۔

علمائے اسلام میں سے بہت سی ہستیوں نے فقہا پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ مراکزِ اقتدار کے گرد جمع ہونے کا میلان رکھتے ہیں۔ اہلِ فقہ کے پاس حکومتِ وقت کے عزائم اور کارکردگی پر کہنے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے۔ اکثر اوقات تو وہ محض اپنا فرض ادا کر رہے ہوتے ہیں کہ آخر شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے کے لیے ہدایات اور رہنمائی فراہم کرنا انہی کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ماہرین قانون تو ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں۔ فقہا کو بھی قانون کی تاویل اور اسے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے برتنے کا فن آتا ہے اور ہر زمانے میں ایسے اہل فقہ ہو گزرے ہیں جو حکمرانِ وقت

کے ہاتھوں اپنی متاعِ ہنر فروخت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ہر بادشاہ کو اکا دکا سرکاری مفتی و ملا ایسا میسر آ جاتا تھا جو اس کی خوشنودی کے لیے حسبِ ضرورت ہر وہ فتویٰ یا ''اسلام کا حکم'' جاری کرنے پر تیار ہو جاتا تھا جس سے حکومتِ وقت کی غرض پوری ہوتی ہو۔

دورِ جدید میں مسلمان اہلِ علم نے سیاسی نظریات، نظامِ حکومت اور علومِ سیاسیات پر غیر معمولی توجہ مبذول کیے رکھی ہے۔ ان کاوشوں کا محرک اکثر اوقات یہ رہا ہے کہ اسلام کو ''جمہوریت'' کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جائے تا کہ مغرب کے پیمانۂ جمہوریت پر اسے پورا ثابت کیا جا سکے (یاد رہے کہ مارکسیت نے بھی ہمیشہ خود کو بہترین جمہوری نظام کی صورت میں پیش کیا ہے)۔ سیاست کے بارے میں اسلام کے حوالے سے کتابیں بہت لکھی گئی ہیں۔ وہ قارئین جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں کسی بھی کتب خانے سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ساری اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے لیے سیاست کوئی زیادہ اہم معاملہ رہا ہی نہیں۔ بہت سے مسلمان مفکرین کو شریعت کی بنیاد پر سماجی ہم آہنگی، اتفاق، اہمی جی اور توازن پیدا کرنے سے گہری دلچسپی رہی ہے مگر ان کی نظر میں یہ کام حکومت کی طرف سے نہ تو ہوتا ہے نہ ہونا چاہیے۔ عوام کو شریعت کی پابندی کرنا چاہیے، اپنے آپ کو شریعت کے مطابق اور دین کی دوسری جہات کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ اگر یہ ہو گیا تو معاشرہ خود ہی سماجی توازن اور ہم آہنگی کی راہ پر پڑ جائے گا۔ قرآنِ مجید میں بار بار ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' bidding to honour and forbidding dishonour کا حکم آیا ہے۔ اس حکم کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا

گیا ہے کہ انسان پر اپنے ماحول اور معاشرے کے سلسلے میں ایک سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ حکم بہت سے احکام میں سے صرف ایک ہے اور دوسرے احکام اس پر فائق ہیں۔ اس حکم کو یہ رنگ دینا مشکل ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے چند اہلِ سیاست کو یہ قوت عطا کردی ہے کہ وہ زمامِ کار سنبھال کر ان پالیسیوں پر عملدرآمد کا آغاز کریں جو "معاشرے کی ضرورت ہیں"۔

اسلامی زندگی کا آدرش ہمیشہ نامیاتی رہا ہے میکانیکی نہیں۔ اس امر کو محسوس کرنا ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ روایتی اسلامی شہروں کے تعمیری مزاج اور بناوٹ پر نظر کی جائے۔ انہیں دیکھ کر جنگل کے سبزہ وگل کی نمو نظروں میں پھرنے لگتی ہے۔ شہر کے جدید تصور کا آئیڈیل ۹۰ درجے کے زاویے پر کٹے ہوئے رقبے کی تقسیم ہے، ایک "عقلی" نظام جو شہر پر خارج سے لاگو کیا گیا ہو۔ اسلامی دنیا کے بہت سے علاقوں میں سیکولر حکومتوں نے پرانے شہروں پر یہی اقلیدسی تقسیم نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کا ایک مقصد تو یہی تھا کہ روایتی معاشرے کے سماجی تانے بانے اور نظام کو درہم برہم کرکے مغرب کے صنعتی معاشرے کے نمونے کے مطابق دوبارہ تشکیل دیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کے جدید سیاسی مفکرین بھی اگر نظامِ حکومت کے بارے میں روایتی تعلیمات کی عقلی توجیہات پیش کر رہے ہیں تو ان کے پیشِ نظر بھی کچھ خاص مقاصد ہیں۔ حدیثِ جبرئیل کے آخری حصے پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس امر کی طرف بھی اشارہ کریں گے کہ ایک خاص قبیل کی جدید عقلیت پرستی پر اتنا بے تحاشا زور دینے سے کیا نقصان ہو رہا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی حاصل ہے، اسلامی اقدار کا انحطاط اور اسلام کے تصورِ کائنات کی بربادی۔

اختتام حصہ اول